ایک منفرد اور مکمّل ناول، ایک مکمّل کہانی

پرنس چلّی

ابنِ صفی

اسرار پبلی کیشنز

الکریم مارکیٹ، مین کبیر سٹریٹ
اردو بازار لاہور۔ فون: 7357022-7321970

چلّی نہ ہوتے تو انسانی تاریخ بالکل سپاٹ ہوتی۔ نہ جنگیں ہوتیں اور نہ طوائف الملوکی فروغ پاتی۔ نہ عروج ہوتا نہ زوال۔ دُنیا اتنی پُر رونق ہرگز نہ ہوتی اور مختلف اقسام کے چلّی اس کے لئے سر دھڑ کی بازی نہ لگاتے۔

چلّی ایک معیار ہے۔ ایک پیمانہ ہے۔ کسی عاقل ترین آدمی کے انجام کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس کی پوری زندگی کا تجزیہ کر ڈالئے اور پھر ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر بیٹھے سوچا کیجئے "یار یہ بھی تو چلّی ہی تھا"

"چلّیت" ایک آفاقی حقیقت ہے۔ ہم سب چلّی ہیں۔ لیکن بڑی عجیب بات ہے کہ خود کو اس بھیڑ سے الگ کر کے تفریح کے لئے دوسرے چلّیوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اگر میری بات پر یقین نہیں تو ذرا ایک نظر اپنے ہوائی قلعوں پر بھی ڈال لیجئے، پھر تخت کے پائے سے بندھے ہوئے عقاب دھوکا نہ دے جائیں تو میرا ذمہ۔ اگر گھی کا ہنڈا سر سے نہ گر جاتے تو میں جرابدہ۔ غرضیکہ ؎

ہم بھی چلّی، تم بھی چلّی، چلی ہے جگ سارا

تو پھر ملاحظہ فرمایئے . . . پرلس چلّی۔

ابن صفی ۱-۱۱-۷۷

شیخ چلّی بہت اداس تھا۔ اداسی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ کالج میں اس کی داڑھی وبالِ جان بن گئی تھی بلکہ وہ اس پر اداس تھا کہ داڑھی کے متعلق اس کی توقعات غلط نکلی تھیں۔ اس نے ایک قصبے کے سیکنڈری اسکول سے میٹرک پاس کیا تھا اور یہی داڑھی آٹھویں درجے سے لے کر میٹرک تک اس کی شریکِ زندگی تو خیر نہیں البتہ شریکِ حال ضرور رہی تھی اور اس کا خیال تھا کہ وہ داڑھی مغربی مصنفین کی داڑھیوں کی طرح آرٹسٹک اور پُرکشش بھی ہے لہٰذا وہ اس پر ہر وقت بڑے پیار سے ہاتھ پھیرتے رہنے کا عادی ہو گیا تھا۔ ایسے مواقع پر بالکل ایسا ہی معلوم ہوتا تھا جیسے اُس سرکش کو قابو میں رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اُسے چوبیسوں گھنٹے سہلایا جاتا رہے، بہرحال اُسے اپنی داڑھی سے بے حد اُنس تھا۔

شیخ چلّی نفیس آباد کے ایک قصبے لوٹک لوٹا کا باشندہ تھا اور اس کا باپ یعنی شیخ چلّی سینئر اس قصبے کا رئیسِ اعظم سمجھا جاتا تھا۔

میٹرک پاس کرنے کے بعد بعض بدخواہوں نے شیخ چلّی سینئر کو مشورہ

دیا کہ صاحبزادے کو اب کالج میں تعلیم دلوا دیتے۔ شیخ چلی سینئر شاید اس
وقت مشورے سننے کے اور پسند کرنے کے موڈ میں تھے۔ لہٰذا شیخ چلی
جونیئر کو بھی ان کے فیصلے کے آگے جھکنا ہی پڑا ویسے اس کا ارادہ تو
اب یہ تھا کہ گنے کے کھیتوں میں تمباکو کی کاشت کرائے گا۔ اُس کا
خیال تھا کہ اگر گنے کے کھیتوں میں تمباکو کی کاشت کی جائے تو ہر حال
میں میٹھی تمباکو پیدا ہوگی۔

مگر اب اس کی یہ اسکیم خاک کا ڈھیر بن چکی تھی۔ اس لئے اب اسے
انٹرمیڈیٹ میں اختیاری مضامین کے مسائل سے الجھنا پڑا۔ بہتیرے نام
تو اس نے ایسے سنے تھے، جو اس کے لئے بالکل نئے اور عجیب سے تھے۔
مضامین کے متعلق معلومات لوٹک لوٹا ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر سے
حاصل ہوئی تھیں۔ اردو اور فارسی سے تو خیر وہ واقف ہی تھا کیونکہ
یہ دونوں اس کے گھر کی لونڈیاں تھیں، لیکن دوسرے مضامین کے نام
سن کر ہی اس کے ہوش اُڑ گئے، لیکن پھر جو غور کیا تو ان میں سے ایک
نام کچھ کچھ مانوس سا معلوم ہوا۔ یہ مضمون تھا سائیکالوجی دراصل اس وقت
اسے یہ نام سن کر اپنے منشی جی یاد آ گئے اور یاد بھی یوں آئے کہ ہیڈ ماسٹر
صاحب نے اس مضمون سائیکالوجی کی تعریف بیان کرنی شروع کردی
تھی۔ انہوں نے بتایا تھا کہ اس مضمون سے ایک دوسرے کو سمجھنے میں بڑی
مدد ملتی ہے۔ اس علم کا جاننے والا صورت دیکھ کر ہی کسی آدمی کو پہچان لیتا
ہے کہ وہ کس قسم کا آدمی ہوگا اور بے چارہ شیخ چلی تو اپنے باپ ہی کی زبانی

سینکڑوں بار سن چکا تھا کہ منشی جی کو سمجھنا بہت مشکل ہے لہٰذا اس نے سوچا
کہ اگر سائیکالوجی کی مدد سے اپنے منشی جی کو سمجھ سکا تو بجائے خود ایک
بہت بڑا کارنامہ ہوگا کیونکہ یہ صرف باپ ہی کی دشواری نہیں تھی بلکہ اس
کی اپنی معلومات کے مطابق اس کے دادا بھی منشی جی کو نہ سمجھ سکے کا ہی
رونا روتے روتے دنیا سے رخصت ہو گئے تھے۔

بہر حال اُس نے اپنے لئے تین اختیاری مضامین اردو، فارسی اور
سائیکالوجی منتخب کر لئے لیکن شہر پہنچا تو دوسری دشواریاں راہ میں حائل
ہوگئیں۔ یہ مضمون ایک کالج کے علاوہ اور کسی کالج میں نہیں پڑھایا جاتا
تھا۔ مگر اس کالج کے متعلق یہ معلوم ہوتے ہی کہ وہاں مخلوط تعلیم رائج ہے
شیخ چلی نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور پھر داڑھی کو سہلاتا ہوا جھینپے ہوئے
انداز میں کسمسایا ہی تھا قبل اس کے کہ دانتوں میں انگلی دبا کر مسکرانے کی
بھی کوشش کرتا۔ مشیروں نے رائے دی کہ چھوٹے شیخ جی حرج ہی کیا ہے
لڑکیاں آپ کی گود میں تھوڑا ہی آ بیٹھیں گی۔ آخر کچھ دیر بعد شیخ جی نے
شرمیلے انداز میں رضامندی ظاہر ہی کر دی۔

بہر حال داخلہ جوں توں لے ہی لیا۔ مگر داڑھی کے متعلق اس کی توقعات
غلط نکلیں اور اُسے بے حد اداس ہو جانا پڑا۔ وہ سمجھا تھا کہ شاید دوسرے
طالب علم اس داڑھی سے مرعوب ہو جائیں گے اور اسے آرٹسٹ نہیں
تو فلاسفر ضرور سمجھیں گے کیونکہ اکثر اس نے اپنی داڑھی میں سقراط کی
داڑھی کی جھلکیاں بھی محسوس کی تھیں۔

مگر لڑکے اس سے مرعوب نہیں ہوتے جیسے ہی وہ اس عظیم الشان برگد کے درخت کے نیچے پہنچا جو کالج کے مونوگرام میں نشان کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ سیکنڈ ایئر کے کچھ لڑکوں نے اُسے گھیر لیا۔

ایک نے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "کہو سیٹھ ادھر کہاں بھول پڑے سنا ہے آج کل ہلدی کے دام چڑھ رہے ہیں"

"آ۔۔۔آ۔۔۔پ کو غ غ غلط فہمی ہوتی ہے شاید" شیخ چلی ہکلایا۔

"ارے نہیں" دوسرا بولا "واقعی تمہیں غلط فہمی ہوتی ہے۔ میں انہیں بارہ سال کی عمر سے ریزر بلیڈ چباتے دیکھتا آرہا ہوں لیکن اس کے باوجود بھی انہیں یہ روگ لگ کر اب اتنا بڑھ گیا ہے۔"

"تم بھی بھول رہے ہو" تیسرے نے کہا جو صورت ہی سے سو فیصدی لفنگا معلوم ہوتا تھا "ارے یہ تو پرسوں تک پھیری میں گوشت بیچا کرتے تھے"

"میں لوٹک لوٹا کا رئیس اعظم ہوں" شیخ چلی کو غصہ آگیا۔ کسی نے پیچھے سے اس کی ٹوپی اُٹھا دی اور وہ جھلا کر مڑا ہی تھا کہ ادھر اٹھی ہوئی ٹوپی کے نیچے سے ظاہر ہو جانے والی چٹیل گاہ کو کسی نے نواز کر رکھ دیا۔

اب تو شیخ چلی آپے سے باہر ہو کر اپنی ہی بوٹیاں نوچنے لگا پھر کچھ مزید ہاتھ اٹھے ہی تھے کہ اچانک ایک بہت لمبا آدمی اُن کے درمیان آگیا۔

"ہٹو لے ایک طرف" اُس نے دو ایک کو دھکیلتے ہوئے کہا۔ بھیڑ کائی کی طرح پھٹ گئی۔ اس نے شیخ چلی کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر کر کہا "برخوردار گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ میں بھی مل لوں، لوٹک لوٹا کے

رئیس اعظم سے کیونکہ میں یہاں کا رئیس اعظم ہوں۔ اے دفع ہو جاؤ تم لوگ کھسکو۔ اس نے دوسروں کی طرف گھونسہ لہرایا اور لڑکے کافی دور کھسک گئے۔

"ہٹو۔ چھوڑو مجھے" شیخ چلی نسوانی انداز میں بڑک گیا۔

"نہیں" لمبے آدمی نے کہا۔

"میں چچا ہوں! میرا ادب کرو۔ دوسرے سال میں میرا آٹھواں سال ہے تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں سایہ عاطفت نصیب ہو رہا ہے ورنہ پہلے سال کے اُلو اس قابل کہاں کہ انہیں منہ لگایا جائے۔ مجھے تو تمہاری داڑھی پسند آگئی ہے اور جو چیز مجھے پسند آجائے اُسے ہر حال میں حاصل کر لیتا ہوں"

اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ شیخ چلی بے بس ہو گیا اُس کا دل چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دے۔ اس کے لئے پہلا اتفاق تھا کہ اس کی اتنی بے قدری ہو رہی تھی ورنہ لوٹک لوٹا ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر تک اُسے چھوٹے شیخ صاحب کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ شیخ چلی کو اپنی بے بسی پر رونا آگیا۔ کالج کی ایسی تیسی اس نے سوچا۔ یہ تو کافروں فرعونوں اور نمرودوں کی بستی ہے۔ شیخ چلی عقل سے کورا ہی سہی لیکن اپنی حفاظت کی حس تو کیچوؤں میں بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا شیخ چلی بھی جبلی طور پر مجبور ہو گیا کہ غصہ تھوک کر گڑگڑانا شروع کر دے۔

"خدا کے لئے بھائی صاحب" اُس نے روہانسی آواز میں کہا "میرا پیچھا چھوڑ دیجئے"

"بھائی صاحب نہیں چچا" لمبا آدمی دوسرے لڑکوں کی طرف دیکھ کر
بولا" میں ان سب حرام زادوں کا چچا ہوں "

"اچھا، اچھا" وہ نچلا ہونٹ بھینچ کر بڑبڑایا۔ لمبے آدمی نے اُسے
چھوڑ دیا اور پیٹھ ٹھونکتا ہوا بولا " میں تمہیں اس سال کا بھتیجا اوّل ڈکلیئر
کئے دے رہا ہوں " پھر اُس نے بُلند آواز میں کہا " سنو! بھتیجو! یہ
اس سال کا بھتیجا خاص الخاص ہے، اس لئے ذرا احتیاط رکھنا " لڑکے
ایک ایک کر کے وہاں سے کھسک گئے۔

●

●

رئیس الحسن! واقعی اس کالج کا رئیس اعظم تھا۔ پروفیسر تک اس سے
دبتے تھے اور اس کی چودھراہٹ ہر حال میں برقرار رہتی تھی۔ وجہ یہ تھی
کہ دوسرے سال میں یہ اس کا آٹھواں سال تھا۔ اس سلسلے میں عام طور پر
لوگوں کا خیال تھا کہ وہ زبردستی فیل ہو جاتا ہے کیونکہ وہ کُند ذہن یا غبی
نہیں تھا۔ اس کے ذہن رسا کے چرچے تھے کالج میں، کالج کے باہر بھی وہ
خاصی شہرت رکھتا تھا۔ کالج میں دھاک تھی۔ کیا مجال کہ کوئی لڑکا سر اٹھا
سکے اور وہ لوگ تو خود کو نہ جانے کتنا اہم سمجھنے لگے تھے، جن سے ہنس کر
وہ گفتگو کرتا تھا یا جن کے نام لے کر مخاطب کرتا تھا۔ وہ تھا ڈے اسکالر
لیکن یہ بات سب کو معلوم نہیں تھی کیونکہ وہ ہمیشہ ہوسٹل ہی میں رہتا تھا۔
کالج کے میَس میں کھانا کھاتا تھا۔ اُس کا گھر شہر ہی میں تھا لیکن گھر والوں
سے اس کے تعلقات کشیدہ تھے، اتنے کشیدہ کہ وہ اپنی کفالت خود
ہی کرتا تھا۔ تقریباً چھ سال سے اس نے گھر والوں سے ایک پائی
بھی نہیں لی تھی۔

سب جانتے تھے کہ وہ اپنے اخراجات کیسے پورے کرتا ہے۔

لیکن ہاسٹل کے وارڈن میں بھی اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اس کے خلاف
کوئی کارروائی کرسکتا۔ اس بیچارے نے کبھی پرنسپل یا پراکٹر سے اس کی
شکایت تک نہیں کی تھی بس وہ رئیس الحسن کے "کاروبار" کے وقت اپنی
آنکھیں بند کرلیتا تھا۔ اس کے علاوہ اور چارہ بھی کیا تھا۔ وہ پرنسپل یا پراکٹر
سے کیسے کہتا کہ ہاسٹل میں تاش کے پتوں کا "کاروبار" ہوتا ہے۔ اس کی
شکایت دراصل اس کی کمزوری ثابت ہوتی تھی وہ ایک نااہل وارڈن
قرار دیا جاتا۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ بہتیری مراعات سے محروم ہو جاتا مثلاً
مفت رہائش کی آسانیاں اور وارڈن شپ کا الاؤنس، لہٰذا وہ اتنا احمق
نہیں تھا کہ اتنی ذرا سی بات کے لئے اپنی راہ میں دشواریاں پیدا کرتا۔
اس نے تو ان "کاروباری" طلبا کو اشارتاً و کنایتاً اکثر ہدایت دی تھی کہ وہ
جو کچھ بھی کریں بہت احتیاط سے کریں۔ اس "کاروبار" کا ڈھنڈورا نہ
پیٹا جانا چاہیئے "کاروباریوں" کو بھلا اس سے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔
وہ اتنے محتاط ہو گئے کہ انہوں نے پیسوں کے بجائے دیا سلائی کی تیلیوں
سے یہ "کاروبار" شروع کر دیا، بعد میں انہیں سے پیسوں کا حساب ہو
جاتا تھا۔

شروع میں ایک ہی اڈہ تھا۔ اس کے بعد تو کئی اڈے کھل گئے،
مگر ہر اڈے پر چچا کی برتری تسلیم کی جاتی تھی اور تسلیم کرنے کا طریقہ یہ
تھا کہ ہر بورڈ سے دو پیسے کی "چچائی" نکالی جاتی تھی اور شام کو ہر اڈے
سے کچھ نہ کچھ چچا کے پاس ضرور پہنچتا تھا اور اس طرح رئیس الحسن خود

کو اس کالج کا رئیس اعظم کہنے میں حق بجانب تھا۔

شیخ چلی کو اس کے متعلق یہ ساری معلومات بعد میں حاصل ہوئیں تھیں۔
وہ تو فی الحال اس پر خوش تھا کہ اس لمبے تڑنگے لڑکے کی حمایت میں آجانے
کے بعد سے دوسروں نے اسے چھیڑنا ترک کر دیا تھا۔ مگر اسے کیا کرتا
کہ اب لڑکیاں بھی اس پر آوازے کسنے لگی تھیں۔ وہ بہت شرمیلا تھا۔
مگر ادھر سے ضرور گزرتا جدھر لڑکیاں ہوتیں اور پھر بعد میں خود پر غصہ
بھی آتا کہ وہ ادھر سے گزرا ہی کیوں تھا لیکن دوسرے موقع پر اس سے
پھر یہی حرکت سرزد ہو جاتی۔ وہ شرماتا اور لجاتا ہوا لڑکیوں کے قریب
سے گزر جاتا۔

ایک دن چچا رئیس الحسن نے اسے پکڑ کر دنیا کی اونچ نیچ سمجھانی
شروع کی "او چلے۔ یہ داڑھی صاف کرا دے۔"
"نہیں چچا۔ یہ بہت مشکل ہے۔ میرا باپ میری گردن اڑا دے گا۔"
"چچا کی پناہ میں آئے ہو برخورداران اگر اپنے باپوں سے ڈرتے
ہیں تو چچا ان پر سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے۔ اسے ہمیشہ یاد رکھنا اور سالے
تمہارا یہ نام بھی بڑا دقیانوسی ہے اسے بدل دو یا نہیں، ٹھہرو تھوڑی
سی تبدیلی ہی سے کام چل جائے گا، مثلاً تم خود کو شیخ چلی پرویز لکھنا
شروع کر دو۔" شیخ چلی پرویز کے اضافے پر بے حد خوش ہوا اور چچا
کی بہت تعریف کی۔
"ٹھہرو۔ یہ بھی نہیں اسے ذرا ماڈرنائزڈ بھی کر دیں، تم لکھا کرو

چلّی پرویز شیخ ۔"

" واہ چچا۔ قسم سے مزا آگیا۔ میں اپنا نام ضرور بدل دوں گا۔"

" باپ کا نام کیا ہے ؟"

" غفور داد شیخ چلّی ۔"

" نہیں چلّی غفور داد شیخ کر دو۔ اور ج۔ غ۔ د۔ شیخ لکھا کرو۔" ج۔ غ۔ د۔ شیخ پرویز شیخ چلّی اُچھل پڑا۔ اسے انگریزی طرز کے مختصر نام بہت پسند تھے۔ ویسے وہ پہلے بھی خود کو ایس چلّی ہی لکھا کرتا تھا۔ مگر مایوسی کے ساتھ، کیونکہ نام تو اُسے وہ پسند تھے جن میں سر نیم کے ساتھ کئی حروف لکھے جاتے تھے۔

" اب اپنے باپ کو خط لکھنا تو پتے پر نام اسی طرح لکھنا ۔"

" مگر ڈاکیہ چکر میں پڑ جائے گا ۔"

" ابے چلّے۔ عقل کے ناخن لے۔ یہ کون سی بڑی بات ہے ج۔ غ۔ د۔ شیخ کے ساتھ رئیسِ اعظم لوٹک لوٹا کا اضافہ کر دینا۔"

" آہاں ۔ چل جائے گا کام۔"

" مگر تم اپنی داڑھی صاف کرا دو ۔"

" میں کیسے یقین دلاؤں چچا کہ میرا باپ بڑا ظالم آدمی ہے ۔"

" اور تم بالکل اُلّو ہو۔ کیا تم نے دُنیا کے بڑے آدمیوں کے متعلق کچھ نہیں پڑھا ؟ کیا تم نہیں جانتے کہ ظلم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے سے انسانیت سر بلند ہوتی ہے ۔"

" وہ ۔ ۔ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ تو ٹھیک ہے مم ۔ ۔ ۔ مگر باپ !"

" یار واقعی تم نرے شیخ چلّی ہی معلوم ہوتے ہو۔ کیا اتنی عقل نہیں رکھتے کہ ہر آدمی پہل گھر ہی سے کرتا ہے۔ گھر سے سیکھو اور ملک و قوم کے کام آؤ۔ مجھے دیکھو میرے باپ نے مجھے عاق کر دیا ہے تب ہی میں اتنی ترقی کر سکا ہوں تم سبھوں کا چچا اور کالج کا رئیس اعظم کہلاتا ہوں ۔ وہ لڑکے بھی مجھے جھک کر سلام کرتے ہیں جن کے ناموں کے ساتھ کنور یا پرنس لگا رہتا ہے آج ہی لکھوا اپنے باپ کو خط کہ تم داڑھی منڈوانے جا رہے ہو۔ نہ صرف داڑھی بلکہ مونچھیں بھی، پروا نہ کرو۔ چچا تمہارے سر پر موجود ہے ۔"

" کیسا لگے گا۔ اگر میں داڑھی منڈا دوں ۔" شیخ چلّی لجا کر بولا۔

" بہت شاندار، بہت حسین ۔"

" نہیں۔ نہیں ۔"

" ابے ہاں۔ کہنا نہ مانے گا تو زبردستی منڈوا دوں گا۔ ویسے اگر خود ہی ایسا کرو۔ تو جلسہ کرا دوں گا۔ کیا سمجھتے ہو۔ بھتیجوں کے لئے بڑا دل رکھتا ہوں اور تم تو اس سال کے خاص الخاص بھتیجے سلمہٗ ہو ۔" ـــــ شیخ چلّی کو داڑھی منڈوانی ہی پڑی اور رئیس الحسن نے بڑی فراخدلی کا ثبوت دیا، جو کچھ بھی کہا تھا کر دکھایا۔ بڑی شاندار ٹی پارٹی ہوئی جس میں رئیس الحسن کے بہتیرے خاص الخاص بھتیجوں نے نہ صرف شرکت کی تھی بلکہ ایک ایک روپیہ مٹھائی کھانے کے لئے شیخ چلّی کو بھی دیئے گئے تھے۔

اور اس عقیقے پر بعض پروفیسروں نے بھی رئیس الحسن کو مبارکباد دی تھی۔

لیکن شاید شیخ چلّی کے کسی عزیز نے جو اسی شہر میں رہتا تھا اس "مونڈن" کی اطلاع اُس کے باپ کو بھی دے دی تھی لہٰذا چوتھے ہی دن اُسے ایک گرما گرم خط باپ کی طرف سے ملا جس میں لکھا گیا تھا "ابے اُلّو کے پٹھے بلکہ گدھے کے بچے بھی، مجھے اطلاع ملی ہے کہ تو نے داڑھی منڈوا دی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو کان کھول کر سُن لے کہ اب میرا تجھ سے کوئی تعلق نہیں رہا، جو لڑکا باپ کی روش سے ہٹ جائے اسے ننگِ خاندان کہتے ہیں۔ ذرا آنکھیں پھیلا کر دیکھ علی برادران ولایت تک ہو آئے لاٹ صاحب اور ملکِ معظم سے ہاتھ ملایا مگر داڑھی نہ منڈوائی اور تو ایسا ناخلف نکلا۔ اب میں کس سے کہوں گا کہ جان بیٹا خلافت پہ دے دو۔ تیرا خرچہ بند۔ آنا جانا بند۔ میں تیری شکل بھی نہیں دیکھوں گا۔"

شیخ چلّی نے خط پڑھا اور سر پیٹ لیا۔ ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ اور پیروں تلے زمین نکل گئی۔ آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا۔ بہرحال ایسے ہی درجنوں محاورے اُس پر بیک وقت پل پڑے۔ وہ جانتا تھا کہ اب اس کا کوئی عذر بھی نہ سُنا جائے گا۔ علاج صرف یہی ہے کہ وہ دوبارہ داڑھی بڑھا کر اس کے سامنے جاتا۔ رو تا گڑگڑاتا منہ پیٹتا اور آئندہ خاندانی وقار کا خیال رکھنے کا وعدہ کرتا، لیکن اس کے لئے وقت درکار تھا۔ جس پائے کی داڑھی وہ کھو چکا تھا دوبارہ اس کے حصول میں کم از کم تین ماہ ضرور لگ جائیں گے۔ پھر یہ تین ماہ گزرنے کیسے جبکہ "خرچہ بند"

کی دھمکی بھی مل چکی تھی۔

شیخ چلّی دم بخود رہ گیا۔ اس کے علاوہ اور چارہ بھی کیا تھا۔ پندرہ دن گزر گئے۔ فیس نہیں جمع ہو سکی اور ایک دن میس سے بھی نوٹس مل گیا۔ اب کھانا اور ناشتہ بھی بند۔ تھوڑے پیسے ابھی اس کے پاس پڑے ہوتے تھے جن سے اُس نے دو دن نکالے۔ لیکن اپنی اس نئی بپتا کا تذکرہ کسی سے نہیں کیا۔

وہ تو نہ جانے کس طرح اس کی بھنک رئیس الحسن کے کان میں پڑ گئی اور جب اس نے خوب اچھی طرح اس کو نچوڑا تو اس کے گالوں پہ موٹے موٹے قطرے ڈھلکنے لگے اور اس نے بدقتِ تمام کہا "داڑھی!"

"داڑھی! کیا مطلب"

"مم مطلب۔ مطلب" شیخ چلّی صرف ہکلا کر رہ گیا۔ شدتِ گریہ سے آواز اس کے حلق میں پھنس رہی تھی۔ آخر جب اُسے کچھ نہ سوجھا تو باپ کا خط نکال کر رئیس الحسن کے سامنے رکھ دیا۔ رئیس الحسن کچھ دیر تک خط دیکھتا رہا پھر بُرا سا منہ بنا کر بولا۔

"تو اب تم مفلسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو جاؤ گے؟" چلّی پرویز نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ویسے اب اس نے اپنے آنسو خشک کر لئے تھے اور اس بیساختہ گریہ زاری پر دل ہی دل میں نادم تھا "بکواس ہے؟" رئیس میز پہ ہاتھ مار کر بولا "تم اب شہزادوں کی طرح زندگی بسر کرو گے۔ چچا کا کوئی ایسا بھتیجا جس پہ باپ کا عتاب نازل ہوا ہو عسرت

کی زندگی نہیں بسر کر سکتا۔ شیخ چلی کچھ نہ بولا۔ ویسے یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ رئیس پھر بولا۔ "تم آج سے پرنس چلّی پردیز ہو۔ پرنس چلّی پردیز۔"

"میرا مذاق نہ اُڑائیے" چلی پردیز بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "ابے چلّے! تجھے اٹھا کر کھڑکی کے باہر پھینک دوں گا۔ کیا سمجھا ہے تو نے چچا کو" رئیس نے جیب سے اپنا پرس نکالتے ہوئے کہا اور پھر سو کا ایک نوٹ کھینچ کر اُسے میز پر رکھتا ہوا بولا۔ "جاؤ فیس جمع کرا دو اور میں ابھی میس والوں کی خبر لوں گا۔ سالے نہیں جانتے کیا تم اس سال کے بھتیجے خاص الخاص ہو۔"

"مم۔ مگر۔ چچا۔ میں ادا کہاں سے کروں گا۔"

"ابے پھر وہی بکواس چلّے! کیا اب مجھے اعلان کرنا پڑے گا کہ میں نے چلّے کو متبنیٰ کر لیا ہے؟"

"نہیں چچا! آپ کے خلوص کا بہت بہت شکریہ! میں اس کا بار نہیں اُٹھا سکوں گا۔"

"تب پھر تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہ جاؤ گے؟ چچا کا غصہ بہت خراب ہے۔ میں کہتا ہوں اٹھاؤ اسے جا کر فیس جمع کرو۔ پڑھ لکھ کر ڈپٹی کمشنر ضرور بنو گے، اس وقت ادا کر دینا۔ ابے یہ میں احسان تھوڑا ہی کر رہا ہوں، یہ تو فنڈ کا پیسہ ہے۔"

"کیسا فنڈ؟"

"انجمن پرورش بچگان نالائق والدین کا فنڈ"، رئیس نے سر ہلا کر کہا۔ "میں اس انجمن کا صدر ہوں، نالائق والدین کے ستائے ہوئے بچوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے یہ انجمن قائم کی گئی ہے۔ تم اس کی پرواہ نہ کرو، بس اٹھو اور دفع ہو جاؤ۔ فیس جمع کئے بغیر اپنی شکل نہ دکھانا! جاؤ۔"

. . . . .

شیخ چلّی بے حد متحیر تھا۔ حیرت کی بات بھی تھی۔ پہلے پہل اس کی موٹی
عقل میں بھی چچا رئیس کی نوازشات کسی قسم کا فراڈ ہی بن کر سمائی تھیں۔
اس نے سوچا تھا کہ وہ اُسے اُلّو بنا کر اس سے رقومات اینٹھا کرے گا۔
لیکن اب وہ اپنے اُن بُرے خیالات کی بنا پر جو کبھی رئیس کی طرف
سے اس کے دل میں پیدا ہوتے تھے، بیحد شرمندہ تھا اس پر رئیس کی
عنایات اب پہلے سے زیادہ تھیں۔ وہ اسی شام کو اُسے ملبوسات کی
ایک بڑی دکان پر لے گیا اور اس کے لئے تین بہترین سوٹ خریدے۔
"چچا! میں اس فضول خرچی کے لئے تیار نہیں" شیخ نے ڈرتے ڈرتے
کہا۔

"بکواس مت کرو چلّے!" "جواب ملا" میں کہہ چکا ہوں کہ تم آج سے
پرنس چلّی پرویز ہو" شیخ چلّی کچھ نہ بولا، اس کی سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا
کہ رئیس کیا کر رہا ہے، کیوں کر رہا ہے اور خود اسے کیا کرنا چاہئیے۔
اُس نے اس سے پہلے مغربی طرز کے لباس کبھی استعمال نہیں کئے
تھے ہمیشہ شیروانی اور پاجامے ہی میں رہتا تھا لہٰذا سوٹ اس کے لئے
وبالِ جان بن گئے۔ وہ جب بھی سوٹ پہن کر باہر نکلتا اُسے ایسا لگتا جیسے
کوئی پیچھے سے آکر کہے گا "میاں کس خیال میں ہو، پتلون کی میانی نیچے
جھول رہی ہے" اسے بڑی الجھن ہوتی تھی مگر مرتا کیا نہ کرتا، چچا کا حکم
وہ کیسے ٹال سکتا تھا جبکہ چچا ہی پر اب اس کے مستقبل کا دار و مدار تھا۔
چچا کا حکم تھا کہ وہ روزانہ باقاعدگی سے شیو کیا کرے اور کاسمیٹکس کا
استعمال بھی ضروری قرار دے دیا تھا۔ دو ہی دن میں میاں چلّی پرویز
کا مکھڑا چاند سا نکل آیا۔ وہ بدصورت نہیں تھا بس لاپرواہی کی بنا
پر اس کی شخصیت صفر ہو کر رہ گئی تھی۔

آج رئیس الحسن اسے ایک دعوت میں اپنے ساتھ لے جانے کا
ارادہ رکھتا تھا۔ چلّی اُس کے ارادے سے واقف ہوتے ہی صرف لسُور
کر رہ گیا تھا۔ احتجاج کے لئے ہونٹ بھی نہیں ہلا سکتا تھا۔ اسے علم
تھا کہ چچا رئیس الحسن کی دعوتوں کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ کسی نائٹ
کلب میں عیاشی، مگر اس رات کا پروگرام شیخ چلّی کے لئے اس سے
بھی زیادہ دل ہلا دینے والا ثابت ہوا۔

اُن دنوں شہر میں حقیقت نامی ایک طوائف کا بڑا شہرہ تھا۔ راستے
میں چچا نے بتایا کہ دعوت حقیقت کے بالاخانے ہی پر ہوگی۔ بس چلّی کو
اس وقت یہی محسوس ہوا جیسے کچھ دیر بعد اُسے اپنے سوٹ سے پسینہ
نچوڑنا پڑے گا۔ "چچ۔ چچا۔ مم۔ مجھے نہ لے جاؤ" اس نے ہکلا کر کہا۔

"پرنس چلّی پردیزآف لوٹک لوٹا۔"

"کوئی ریاست ہے؟"

"ہاں پُورب میں ایک اچھی خاصی ریاست ہے۔" اس کے بعد وہ دوسروں کی طرف مخاطب ہوگئی تھی۔ وہ کافی رات گئے تک وہاں رہے۔ شیخ چلّی کو کچھ نہیں معلوم کہ اتنی دیر میں وہاں کیا کیا ہوا تھا۔ بس اُسے تو صرف ایک بات یاد رہ گئی تھی۔ وہ یہ کہ جب وہ وہاں سے رخصت ہونے لگے تھے تو اُس عورت نے مسکرا کر اس سے کہا تھا: "پھر بھی آتے رہئیے گا کنورجی"

لیکن چلّی کو یہ یاد نہیں کہ اس نے نفی میں سر ہلایا تھا یا اثبات میں زبان تو کھل ہی نہیں سکی تھی۔ ویسے مقصد اس کی سمجھ میں نہیں آسکا اس رات وہ صبح تک کروٹیں بدلتا رہا، لیکن اس کا جواب اُسے نہ مل سکا۔ کہ رئیس اُسے وہاں کیوں لے گیا تھا۔

. . . . .

●

دو ماہ گزر گئے اور چلّی عوامی زبان میں کافی "چالو" ہوگیا تھا اس درمیان میں وہ صرف اپنے اعزا کی زبانی باپ کی دھمکیاں سنتا رہا تھا۔ دونوں میں خط وکتابت نہیں تھی۔ چلّی نے اب یہ سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا کہ رئیس الحسن اس پر اتنا مہربان کیوں ہے۔ مختلف قسم کی تفریحات میں اس کا وقت گزرتا۔ طوائفوں کے یہاں آمد ورفت سے چلّی کو صرف اتنا فائدہ ہوا تھا کہ اب وہ عورتوں سے بے جھجک ہوکر گفتگو کرسکتا تھا۔

لیکن یہ سوال اب بھی اس کے ذہن میں کچوکے لگاتا رہتا تھا کہ رئیس نے آخر اُسے طوائفوں کے یہاں کیوں لے جانا شروع کیا تھا؟ اور پھر اب اُس کا رویہ کیوں بدل گیا تھا؟ اُس نے اس سلسلے میں لاپرواہی کیوں اختیار کر لی تھی۔ اس سے پہلے رئیس کے ساتھ جانا لیے حد ضروری ہوتا تھا مگر اب وہ کبھی اس کا تذکرہ بھی نہیں چھیڑتا اور نہ ہی یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ تنہا ہی وہاں جاتا ہوگا۔ لیکن خود اسے تو چاٹ پڑ ہی چکی

کیسے سمجھ لیتا کہ وہ از راہِ خدا ترسی اس کی مدد کر رہا ہے، خود شیخ چلّی کے ذہن میں بچپن ہی سے یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ صرف عبادت گزار اور متقی ہی لوگ خُدا ترس ہوتے ہیں اس لئے رئیس الحسن خُدا ترسی کے معیار پر پورا اتر ہی نہیں سکتا تھا۔

شام کو وہ چلّی کے کمرے میں آیا لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ باہر جائے گا کیونکہ اس نے لباس تبدیل کیا تھا "سنو چلّے" اس نے کہا "تمہارے پیٹ میں تو چوہے دوڑ رہے ہوں گے لیکن اب میں نہ جا سکوں گا۔ تم زبیر کے ساتھ چلے جاؤ۔ مجھے پرلسٹن والوں سے تین دن کی چپاتی وصول کرنی ہے۔ یہ لوگ بغاوت پر آمادہ معلوم ہوتے ہیں"

"کیوں پرلسٹن والے تو بہت زیادہ دبتے تھے تم سے؟" چلّی نے کہا۔

"ہاں۔ آں! . . . وہاں . . . وہ صاحبزادے جو ہیں نا ٹھاکر جسپال سنگھ جی وہ چچا کی چودھراہٹ ختم کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں حالانکہ چچا ۸ سال سے یہاں حکومت کر رہا ہے نہ جانے کتنے ٹھاکر جسپال آتے اور چلے گئے۔ ارے خیر۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ زبیر کے ساتھ چلے جانا۔"

"ارے تو جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"بحث نہیں چلّے!" چچا کی آواز غصیلی تھی۔ چلّی خاموش ہو گیا۔ زبیر چچا کے خاص مصاحبوں میں سے تھا اور یہ بھی کسی دولتمند گھرانے ہی سے تعلق رکھتا تھا۔ پانچ بجے دونوں فیرنیز ونگ جانے کے لئے نکلے۔ "بڑی شاندار جگہ ہے" زبیر نے کہا "کیا تم پہلی بار جا رہے ہو؟"

"ہاں اس سے پہلے میں نہیں گیا"

کچھ دیر بعد زبیر نے کہا "میں وہاں ایک آدمی کے ساتھ شطرنج کھیلوں گا۔ تم شطرنج کھیلنا تو جانتے ہی ہو گے؟"

"اکثر کھیلتا رہا ہوں"

"اسے بس اتنا کافی ہے کہ مہرے پہچانتے ہو اور چالیں جانتے ہو"

"اچھی طرح کھیل بھی سکتا ہوں"

"بس ٹھیک ہے۔ تمہیں دراصل دوسرے آدمی کے کھیل کی تعریف کرنی ہوگی، زمین و آسمان کے قلابے ملا ملا کر رکھ دینا"

"کیوں؟"

"بس یونہی، میں نہیں جانتا۔ چچا نے یہی کہا ہے"

"یار زبیر! یہ چچا میری سمجھ میں نہیں آتا"

"جس دن چچا تمہاری سمجھ میں آئے گا۔ اُس دن تم دُنیا کے بہت بڑے آدمی ہو گے"

"میں نے ایسا آدمی آج تک نہیں دیکھا۔ پہلے مجھے طوائفوں کے یہاں لے جاتا رہا ہے اور اب کہتا ہے اگر میں نے طوائفوں کے محلّے کا رخ بھی کیا تو میری ٹانگیں توڑ دے گا"

"یقیناً توڑ دے گا" زبیر نے سر ہلا کر کہا "جو کچھ کہتا ہے کر گزرتا ہے"

"مگر چسپاں کا کیا قصہ ہے، سنا ہے اُس نے پرنسٹن والوں کو چچائی ادا کرنے سے روک دیا ہے۔"

"ہاں قصہ تو کچھ ایسا ہی ہے، لیکن تم کچھ دنوں کے بعد چسپاں کو چچا کے قدموں میں دیکھو گے۔ میں نے ایک نہیں درجنوں ایسے سورما دیکھے ہیں جنہیں چچا سے ٹکرانے کا خبط ہو گیا تھا لیکن یہ سمجھ لو کہ ان کی ذلت کی کہانیاں کالج میں ضرب المثل بن کر رہ گئی ہیں۔" چلّی پھر خاموش ہو گیا۔ پتہ نہیں کیوں اُس نے خاموشی اختیار کر رکھی تھی ورنہ اس کا دل تو چاہتا تھا کہ زبیر سے اپنے متعلق پوچھے کہ چچا اس پر اتنا مہربان کیوں ہے۔ "چچا جو کہتا ہے کر گزرتا ہے۔" زبیر تھوڑی دیر بعد پھر بولا۔ "اس لئے جو کچھ کہے کرتے رہو، اس کے دوست ہمیشہ مزے میں رہتے ہیں۔"

"مگر بھائی! ہر چیز کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔"

"مقصد ہے اپنے دوستوں کو فائدہ پہنچانا۔"

"مگر اس سے چچا کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟"

"میں نے اس کے متعلق سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے، شروع شروع میں میں بھی یہی سمجھتا تھا کہ چچا میری جیبیں خالی کر لے گا مگر ایسا نہیں ہوا اور جب میں یہاں آیا تھا تو تم سے زیادہ گدھا تھا، مگر آج میں محسوس کرتا ہوں کہ ساری دُنیا کو اپنی انگلیوں پر نچا سکتا ہوں۔"

"یہ بات تو میں نے بھی محسوس کی ہے۔ میں زیادہ آدمیوں کے درمیان زبان کھولنے سے بھی ڈرتا تھا، مگر اب،"

"مگر اب" زبیر مسکرایا۔ "اب عورتوں میں بھی بیٹھ کر باتیں بنا سکتے ہو۔" شیخ چلّی نے ایک طویل سانس لی اور خود بھی مسکرا دیا پھر بولا۔

"ہاں! اب مجھے عورتوں سے خوف نہیں معلوم ہوتا۔"

"پھر بھی پوچھتے ہو کہ چچا تمہیں طوائفوں کے یہاں کیوں لے جاتا رہا ہے۔"

"کیا؟" چلّی نے حیرت سے کہا "نہیں۔" چند لمحے خاموش رہا پھر بے ساختہ ہنس پڑا۔

"کمال ہے۔" اس نے کہا "یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے مگر میری سمجھ میں نہ آسکی۔"

"بس مقصد یہی تھا کہ تم عورتوں سے بھی بے جھجک ہو جاؤ۔"

"آہا۔ مگر . . . مقصد، پھر وہی مقصد! اگر میں عورتوں سے بے جھجک ہو گیا تو اس سے چچا کو کیا فائدہ؟"

"یہ مت سوچو۔ ضرورت ہی کیا ہے، جس طرح چند دوسری باتیں تمہاری سمجھ میں آ گئی ہیں اس طرح مقصد بھی ایک دن سمجھ سکو گے۔"

وہ فیریز ونگ پہنچ گئے۔ عمارت ہی دیکھ کر چلّی پر دیدہ دنگ رہ گیا اس سے پہلے اس نے اس کلب کا صرف نام ہی سنا تھا۔ عمارت دیکھنے کا ابھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ یہاں کے ممبر محدود تھے اور غیر ممبروں کا داخلہ بھی صرف اسی صورت میں ہو سکتا تھا جب وہ کسی ممبر کے ساتھ جائیں۔ نئے ممبر پُرانے ممبروں کی سفارش پر بنائے جاتے تھے۔

داخلے کے لئے زبیر کو پھاٹک پر کھڑے ہوئے ایک باوردی آدمی کو اپنا ممبری کارڈ دکھانا پڑا۔ ایک رجسٹر پر اپنا اور چلی پرویز کا نام لکھ کر دستخط کرنے پڑے۔ کمپاونڈ میں ایک شاندار پائیں باغ تھا۔ اندر پہنچ کر تو شیخ چلی کو چکر سے آنے لگے اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے پرستان میں پہنچ گیا ہو۔ شاید آج یہاں کوئی خاص قسم کی تقریب بھی تھی کیونکہ ہال کی چھت سے بیشمار غبارے اور کاغذ کے پھول لٹکے ہوئے نظر آرہے تھے، اور ان کے اوپر ریشمی پٹیوں کا جال سا بُنا گیا تھا۔ ہال کی ساری میزیں قریب قریب بھر گئی تھیں۔

زبیر ایک میز کی طرف بڑھا جس پر صرف ایک بوڑھا آدمی نظر آرہا تھا اس کی عمر ستر کے قریب ضرور رہی ہوگی، لیکن صحت اچھی تھی۔ قویٰ مضبوط معلوم ہوتے تھے۔ زبیر کو دیکھ کر بوڑھے نے مضطربانہ انداز میں ہاتھ ہلایا "آؤ۔ آؤ۔ بہت دیر کردی تم نے، میں کب سے انتظار کر رہا ہوں "

"آج دیر ہوگئی سر فیاض۔ مجھے افسوس ہے۔ ویسے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بازی کب ختم ہوگی"

"ارے چلنے دو میاں۔ جب دو دیو آپس میں ٹکراتے ہیں تو فیصلہ مشکل ہی سے ہوسکتا ہے"

"میں آپ سے اچھا کھیلتا ہوں سر فیاض" زبیر نے کہا۔

"تو ختم کردو نا بازی۔ کیوں صاحب"

بوڑھے نے چلی کی طرف دیکھ کر کہا۔ شیخ چلی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ زبیر اتنے بوڑھے آدمی سے اسی طرح بے تکلف ہے جیسے وہ اس کا کوئی ہمجولی ہو۔

بساط بچھ گئی۔ دونوں نے اپنی جیبوں سے بازی کے نقشے نکالے اور اس کے مطابق مہرے لگانے لگے۔ شاید یہ بازی بہت دنوں سے چل رہی تھی اور ابھی تک ہار جیت کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔

چلی نے کچھ دیر بعد اسٹارٹ لیا، شروع میں تھوڑی سی دشواری ضرور پیش آئی تھی لیکن پھر زبان قینچی کی طرح چلنے لگی "ارے واہ جناب۔ کیا چال تھی، ایسا کھیل کم دیکھنے میں آیا ہے زبیر صاحب، خواہ دس سال لگ جائیں مگر مات آپ ہی کی ہوگی کیا چالیں ہیں، سبحان اللہ"

تھوڑی دیر تک چلی تعریفوں کے ڈونگرے برساتا رہا پھر سر فیاض نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔

"آپ کی تعریف" انہوں نے زبیر سے پوچھا "ارے آپ انہیں نہیں جانتے ہیں تو سمجھا تھا کہ آپ دونوں پہلے ہی سے واقف ہوں گے۔"

"نہیں شاید میں نے انہیں پہلی بار دیکھا ہے" سر فیاض نے کہا۔

"ارے یہ ہیں پرنس چلی پرویز آف لوٹک لوٹا"

"اوہ" یک بیک بوڑھے کی آنکھیں چمکنے لگیں "آپ ہی ہیں۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ میں تو آپ سے ملنے کا متمنی تھا جناب۔ سر فیاض اور چلی نے گرم جوشی سے مصافحہ کیا" میں پہلے ہی آپ کی تعریفیں سُنتا رہا ہوں" سر فیاض نے کہا اور چلی بھونچکا رہ گیا۔ اس نے تو آج سے پہلے سر فیاض کا نام بھی نہیں سُنا تھا۔ لیکن خود اس کی تعریف

ان تک کیسے پہنچ گئی۔

"جی ہاں" زبیر سر ہلا کر بولا "یہ وہی پرنس چلّی پدوینر ہیں جنہوں نے آج تک شیر کا شکار مچان پر بیٹھ کر نہیں کیا۔"

"میں تہہ دل سے آپ کا قدر دان ہوں پرنس" سر فیاض نے سنجیدگی سے کہا اور چلّی نے بوکھلا کر سر جھکا لیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کس قسم کی گفتگو شروع ہوگئی۔ کیسا شیر کہاں کی مچان اور یہ شکار وکار کا کیا قصّہ ہے۔

"اف وہ پرنس" دفعتاً زبیر بولا "واقعی عجیب آدمی ہو۔ ارے سر اٹھاؤ۔ یہ کیا لڑکیوں کی طرح شرما گئے۔ سر فیاض کیا بتاؤں، یہ بڑی زبردست کمزوری ہے پرنس میں، اپنی تعریف سن کر بالکل پردہ نشین لڑکیوں کی طرح شرما جاتے ہیں"

"خوبی ہے" سر فیاض نے میز پر ہاتھ مار کر پرجوش لہجے میں کہا۔ "نجیب الطرفین لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ان میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ واللہ پرنس آپ سے مل کر بیحد خوشی ہوئی۔ بھئی زبیر صاحب کھیل بند۔ بازی کا نقشہ بنا لیجیے کل کھیلیں گے، اب تو اس وقت میں پرنس سے گفتگو کروں گا"

پرنس بیچارے کی جان نکل کر رہ گئی۔ پتہ نہیں کس قسم کی گفتگو ہو۔ اگر شیر کے شکار ہی سے متعلق ہوئی تو وہ کیا کرے گا۔ شیر تو بڑی چیز تھی اس نے آج تک خرگوش کا شکار بھی نہیں کیا تھا۔ بندوق کے نام ہی سے ہول آتا تھا ویسے اس نے شیر کے شکار کے بہتیرے قصّے ضرور سن رکھے تھے۔ مگر کیا یہ ضروری تھا کہ وہ زبیر ہی کی طرح روانی سے جھوٹ

بول سکتا۔

زبیر بازی کا نقشہ مرتب کرنے لگا اور سر فیاض چلّی کی طرف متوجہ ہو گئے لیکن چلّی جلدی سے بولا۔

"آپ کھیلئے جناب! واللہ بڑا مزہ آرہا تھا اس بازی میں ویسے ہمارے والد حضور بھی بہت اچھی طرح شطرنج کھیلتے ہیں لیکن یہ آپ کی چالیں! تعریف نہیں ہوسکتی"

"ارے بھئی اب کہاں" سر فیاض خوش ہو کر بولے "اب تو بڑھاپے نے دماغ ہی چوپٹ کر کے رکھ دیا ہے، ورنہ بازی اتنی طویل نہ ہو پاتی"

"مجھے عرصہ تک اس وقت کی چالیں یاد رہیں گی"

سر فیاض ہنسنے لگا، کچھ دیر تک خاموشی رہی، پھر انہوں نے کہا۔ "شیر کا شکار میں نے بہت کھیلا ہے۔ لیکن آپ کی طرح نہیں، ہمیشہ مچان پر سے" شیخ چلّی سمجھ گیا کہ زبیر پہلے اس کے متعلق سر فیاض سے مبالغہ آرائیاں کر چکا ہے، اس لئے یہ شیر کا شکار مچان کی بجائے زمین سے ہی ہوسکتا ہے، اس نے ایک طویل سانس لی اور جی کڑا کر کے بولا۔

"یہ تو اپنا اپنا شوق ہے جناب! نشانہ چونکہ کم خطا کرتا ہے، اس لئے خود اعتمادی پیدا ہوگئی ہے"

"یقیناً یقیناً خود اعتمادی ہی تو سب سے بڑی چیز ہے"

"ویسے مچان پر نہ بیٹھنے کی قسم بھی نہیں کھائی۔ اکثر مچان پر بھی بیٹھا ہوں۔ مگر قسم لے لیجئے، جو کبھی مچان سے گولی چلائی ہو"

"پھر بیٹھنے سے فائدہ ہی کیا؟" سر فیاض نے متحیرانہ لہجے میں سوال کیا۔

"فائدہ! اب کیا بتاؤں شرم آرہی ہے۔ شوق ہی تو ہے۔"

"یعنی مچان پر بیٹھنے کا شوق ہے۔" سرفیاض کی حیرت اور زیادہ بڑھ گئی اور زبیر بھی شیخ چلّی کو گھورنے لگا۔ لیکن چلّی جلدی سے بولا "جی نہیں، وہ منظر دیکھنے کا شوق ہے جب شیر بھینسے کی گردن دبوچتا ہے اور۔ اور بھینسے کا جسم تو بالکل ساکت ہوجاتا ہے لیکن دُم بڑے غمناک انداز میں ہلتی رہتی ہے اور شیر جھلا کر اس کی دُم توڑ دیتا ہے۔"

"محض اس لئے آپ ایک بھینسا ضائع کرتے ہیں؟"

"پھر عرض کروں گا کہ والدحضور نے بعض شوقوں کے لئے کئی گاؤں ضائع کردیئے ہیں۔"

"اوہ۔ یقیناً۔ یقیناً۔ میں نے یہ بات یونہی کہہ دی تھی۔ والیانِ ریاست کا کیا کہنا۔ سبحان اللہ! ویسے کیا آپ کا سلسلۂ نسب کسی بادشاہ سے ملتا ہے۔"

"جی ہاں۔ نادرشاہ درانی سے۔" چلّی نے شرما کر جواب دیا۔

"واہ سبحان اللہ۔ اچھا آپ نے اب تک کتنے شیر شکار کئے ہوں گے؟"

"صرف گیارہ عدد! بات یہ ہے کہ والدحضور مجھے بیحد چاہتے ہیں بس چوری چھپے شیر کا شکار ہوجاتا ہے۔"

"اکلوتے ہیں آپ؟"

"جی ہاں۔"

"سبحان اللہ۔ اس کے باوجود آپ اتنے شریف، منکسرالمزاج۔ ہا۔۔ جی ہاں۔ ۔ ۔ کیوں نہ ہو آپ کی رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا ہے۔"

شیخ چلّی اور شرما گیا۔ اس کا سلسلۂ نسب کسی نہ کسی طرح نادرشاہ دُرانی تک ضرور جا پہنچتا تھا لیکن چلّی اسے ہمیشہ افواہ ہی سمجھتا تھا۔ اس لئے حوالہ تو دے دیا تھا لیکن نروس بھی ہو رہا تھا۔

"کبھی ہمارے یہاں بھی آیئے پرنس۔" سرفیاض بولے۔ "میں آپ کو ان شیروں کی کھالیں دکھاؤں گا جو میں نے شکار کئے تھے۔"

"ضرور آؤں گا جناب۔ مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ ایسے بزرگ اب کہاں ملتے ہیں جو جوانوں سے برابری کا برتاؤ کریں۔ میرے والدحضور تو مجھے ننھا سا بچہ سمجھ کر مجھ سے کبھی اس قسم کی گفتگو ہی نہیں کرتے۔"

"بھئی پرنس! بزرگوں کی شان تو یہی ہے، میری بات تو رہنے دو۔ میں نے اپنے پندرہ بیس سال مغربی ممالک میں گزارے ہیں۔ میں تو اپنے بچوں میں بچہ ہی بنا رہا ہوں۔" شیخ چلّی نے اس پر سرفیاض کی بیحد تعریف کی اور کافی دیر تک اُن کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ پھر نشست برخواست ہوگئی۔ زبیر نے کلب سے نکل کر چلّی کی پیٹھ ٹھونکی اور بولا۔ "واقعی اب تم چل نکلے ہو اور یہ صرف چچا دی گریٹ کا کمال ہے۔ مجھے تو بس مزہ آگیا تھا جب تم بھینسے کی دُم ہلا رہے تھے۔"

"مگر یہ سب تھا کیا بڑے بھائی مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں میں اختلاجِ قلب کا مریض نہ ہوجاؤں۔"

"میں کچھ نہیں جانتا ہوں۔ تمہیں بتا چکا ہوں کہ چچا کبھی بتاتا نہیں ہے کیا پہلے اس نے تمہیں بتا دیا تھا کہ وہ تمہیں طوائفوں کے

یہاں کیوں لے جاتا ہے یا اب یہ بتا دیا ہے کہ اب تمہیں وہاں کیوں
نہیں جانے دیتا؟"

"نہیں بتایا۔"

"بس تو یہ سمجھو کہ وہ دراصل یہ چاہتا تھا کہ تمہیں عورتوں کے سامنے
بولنا آجائے۔"

"لیکن یہ شیر کا شکار۔"

"خدا بہتر جانتا ہے۔ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ اُس نے مجھ سے
یہی کہا تھا کہ کچھ دنوں تک سرفیاض سے تمہاری تعریفیں کروں پھر
دونوں کو ملا دوں۔ خصوصیت سے شیر کے شکار کا معاملہ ضرور اس
کے علم میں لاؤں۔"

"ارے مجھے تو رائفل اور بندوق کے نام ہی سے ہول آتا ہے،
مگر تم نے مجھے پہلے ہی کیوں نہیں بتایا تھا۔ اب میں اگر سرے
سے انکار ہی کر دیتا تو۔"

"چچا تمہیں زندہ دفن کر دیتا۔"

"تو پھر بھی پہلے سے بتا دینے میں کیا حرج تھا؟"

"میں چاہتا تھا کہ شکار کے تذکرے پر تم نروس ہو جاؤ، اور
میں اُسے تمہارا شرمیلا پن ثابت کرنے کی کوشش کروں۔ ویسے
مجھے یقین تھا کہ تم شیر کے شکار کے قصے تو دہرا ہی سکو گے، کیونکہ
اس موضوع پر ہمیں اکثر بور کرتے رہے ہو۔ وہ کون تھے تمہارے
سوتیلے چچا جو گھوڑے کی دُم پر بیٹھ کر شیر کا شکار کیا کرتے تھے۔؟"

"تم ان کا مذاق نہ اڑاؤ۔" چلی نے بُرا مان کر کہا "یہ جھوٹ نہیں

ہے کہ وہ گھوڑے پر بیٹھ کر شیر کا شکار کرتے تھے۔"

"ابے تو وہ گھوڑا بھی تمہارے چچا ہی کی طرح بہترین نشانے باز
رہا ہوگا۔ شیر کی شکل ہی دیکھ کر گھوڑے کا ہارٹ فیل ہو جاتا ہے۔"

"ہو جاتا ہوگا۔ وہ عربی نسل کا گھوڑا تھا۔"

"حالانکہ عرب اونٹ پر بیٹھ کر شیر کا شکار کرتے ہیں۔" زبیر
نے چڑانے والے انداز میں کہا۔

"بس ختم کرو، ورنہ مجھے غصہ آجائے گا۔"

"ختم کر دیا۔ اس وقت تم سے ایسا جی خوش ہوا ہے کہ بس۔
غصہ بھی کر لو۔ برداشت کر لیں گے۔"

"لیکن اگر اس نے دوسری ملاقات پر شیر کے متعلق کوئی علمی بحث
چھیڑ دی تو میں کہاں سر پھوڑوں گا؟"

"ارے بس ختم کرو۔ کبھی اس کے باپ نے بھی شیر کا شکار نہ کیا ہو
گا۔"

"اچھا اب میں اُسے شطرنج میں اُلجھا لوں گا۔ میں تم سے اچھی شطرنج
کھیلنا جانتا ہوں۔ تم ابھی اناڑی ہو اور۔ اور وہ بھی نرا اناڑی ہے۔ میں
اُسے تو مات دے سکتا ہوں۔"

"وہ، وہ تو مجھے اس لئے اپنے گھر پر مدعو کر گیا ہے کہ اپنے شکار کئے
ہوئے شیروں کی کھالیں مجھے دکھا سکے۔" چلی نے کہا۔

"سنو پیارے چلی۔ ہم دونوں یہاں پردیسی ہیں۔ لہٰذا مقامی
لوگوں کے متعلق چچا سے زیادہ نہیں جان سکتے۔ یہ بات مجھے چچا ہی سے
معلوم ہوئی تھی کہ اس نے بہت سی کھالیں ادھر اُدھر سے خرید کر اکٹھی کر رکھی ہیں۔"

چلی کچھ نہ بولا۔

. . . . . .

اس دن کے بعد پھر فیاض سے ملنے کی نوبت نہیں آئی۔ یہ رئیس الحسن کا حکم تھا کہ وہ کبھی تنہا کلب نہ جاتے اور نہ اُسے سر فیاض کی کوٹھی کی طرف جانے کی اجازت تھی۔ چلی کا دل چاہتا تھا کہ وہ اپنا سر کسی دیوار سے ٹکرا کر ساری الجھنوں کا خاتمہ کر دے۔ رئیس الحسن نے خود ہی اسے سر فیاض سے ملوایا تھا اور اب خود ہی کہہ رہا تھا کہ وہ اس سے زیادہ نہ ملے۔ رئیس الحسن اس کے لئے آہستہ آہستہ مصیبت بنتا جا رہا تھا۔ یہ مصیبت ہی تو تھی کہ وہ اُس کے سامنے مجبور محض بن کر رہ گیا تھا، جو کچھ کہتا وہی اُسے کرنا پڑتا۔ یہ بھی کوئی الجھن کی بات نہیں تھی کیونکہ نہ تو ابھی رئیس الحسن نے اُسے مُرغا بنایا تھا اور نہ یہی کہا تھا کہ وہ اپنی ناک کاٹ کر کالج کے ٹاور پر چپکا آئے مصیبت دراصل وہی الجھن تھی، جو بعض حرکتوں کا مقصد نہ معلوم ہونے پر اسے اکثر اختلاجِ قلب کا مریض بنا دیتی تھی۔

اس کے اخراجات کا بار اب بھی رئیس الحسن ہی اٹھاتے ہوئے تھا اور ویسے ہی شاہانہ انداز میں جس میں بار سنبھالنے کی شروعات

ہوتی تھی۔ وہ چاروں طرف آنکھیں پھیلا کر دیکھتا مگر کوئی ایسا نظر نہ آتا جس میں رئیس الحسن سے ٹکر لینے کی ہمت ہوتی۔

ایک جیپال نے کچھ دن ہمت کی تھی، لیکن اب وہ بھی اس کے پیچھے دم ہلاتا پھر رہا تھا اس پر تو چلی کو بڑی حیرت تھی۔ اُس نے سنا تھا کہ جیپال بھی بڑے دل گُردے کا نوجوان ہے اور اس نے بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے، وہ عنقریب ہی چچا کی چودھراہٹ ختم کرے گا۔ مگر اب معاملہ اس کے برعکس تھا۔

خود چلی نے اس کایا پلٹ کے متعلق رئیس الحسن سے پوچھا۔

"اوے چلّے! یہ راز کی بات ہے پیارے مگر میں تمہیں ضرور بتاؤں گا تاکہ تمہیں چچا کی طاقت کا علم ہو جائے۔ مگر اس کا تذکرہ اور کسی سے نہ لے پاتے ورنہ تم چچا کو اپنے حق میں ظالم بھی پاؤ گے اور تمہیں ایک بھی ایسا نہ ملے گا جو تمہاری فریاد سن لے۔"

"ارے نہیں چچا! واہ کیا بات ہوتی۔" چلی اپنے دونوں کان کھینچ کر بولا۔

"یہ جیپال صاحب ایک عورت کے اغوا کے کیس میں دھر لئے گئے تھے۔" رئیس الحسن اپنی بائیں آنکھ دبا کر مسکرایا لہٰذا۔ پھر ظاہر ہے ایسے آڑے وقتوں میں چچا ہی یاد آتا ہے سالوں کو۔"

"کیا ہوا تھا؟" شیخ چلی کا اضطراب اور اشتیاق بڑھ گیا۔

"بھئی یہ عیاش لونڈے اسی طرح مارے جاتے ہیں۔ شہر میں آپ نے ایک دلال سے سودا کیا تھا ایک لڑکی کا، وہ لڑکی لایا۔ آپ لڑکی کو رکشہ پر بیٹھا کر جیسے ہی گلی کے موڑ پر پہنچے ایک آدمی نے رکشہ روک

لیا۔ تب جپال جی کو معلوم ہوا کہ وہ ایک آدمی کی بیوی کو بھگائے لئے
جا رہے تھے۔ ایک بہت بڑی بھیڑ اکٹھی ہوگئی۔ ظاہر ہے چچا کا گزر
بھی اُسی وقت اُس طرف سے کیوں نہ ہوتا۔ لیکن اس وقت چچا دُور
سے تماشا ہی دیکھتا رہا جب تک کہ وہ حضرت لڑکی سمیت تھانے
نہیں پہنچ گئے اور پھر تھانے سے انہیں چچا کے علاوہ اور کون بے داغ
نکال لاتا۔ کیا سمجھے چلّے؟"

چلّی بے چارہ سنّاٹے میں رہ گیا۔ وہ چلّی ہی سہی لیکن اس وقت
یہ بات بالکل اچھی طرح اس کے سمجھ میں آگئی تھی کہ دلّال کیسا رہا ہوگا،
لڑکی کیسی رہی ہوگی اور تھانے میں کیا ہوا ہوگا۔ تقریباً سارے ہی
تھانوں کے انسپکٹروں سے چچا کی خاصی جان پہچان تھی۔

"بہت خطرناک آدمی ہو چچا۔" چلّی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"میں نہیں۔ یہ کھوپڑی۔" چچا نے کنپٹی پر انگلی رکھ کر کہا۔ "میں
تو صرف گوشت کا لوتھڑا ہوں، جو والدین کی وجہ سے عالمِ وجود
میں آیا تھا۔"

"والدین کی وجہ سے؟"

"اور نہیں تو کیا آسمان سے ٹپکا تھا لیکن یہ کھوپڑی بھی والدین
ہی کی ہوتی بشرطیکہ انہوں نے اسے بھٹکنے نہ دیا ہوتا۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"چلّے یہ ایک لمبی داستان ہے۔ تم جانتے ہو کہ میں نے آٹھ سال
سے اپنے گھر کی صورت بھی نہیں دیکھی۔"

"ہاں! مجھے اس پر حیرت ہے۔"

"تمہیں اس بات پر حیرت نہ ہونی چاہیئے۔ کیونکہ پتہ نہیں تمہیں بھی
کب گھر کی صورت دیکھنے کا موقع نصیب ہو۔" رئیس اپنی بائیں آنکھ
دبا کر بولا اور چلّی کا دل بڑی شدت سے دھڑکنے لگا۔ اور یک بیک
اُسے خیال آیا کہ وہ بھی چچا ہی کی طرح خانہ بدوش ہو چکا ہے۔ پھر
اس کا دل بھر آیا۔ وہ بسُور ہی رہا تھا کہ رئیس الحسن ہاتھ اٹھا کر بولا۔

"گھر یاد آگیا ہے؟"

"ہاں۔" چلّی نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر آنسو پینے کی
کوشش کی۔

"مجھے افسوس ہے۔" رئیس الحسن نے سر ہلا کر کہا۔ "تم میں ابھی
کئی کمزوریاں باقی رہ گئی ہیں۔ خیر ان کا بھی علاج ہو جائے گا، پرواہ
نہ کرو۔"

"چچا۔ میں اب گھر واپس جانا چاہتا ہوں۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" رئیس الحسن نے خشک لہجے میں کہا۔
"مگر اتنا یاد رکھو کہ جس طرح جپال تھانے پہنچ گیا تھا اُسی طرح ایک
حاملہ طوائف تمہارے گھر پہنچ جائے گی اور وہ تمہارے باپ سے
رو کر کہے گی کہ تم ہی اس کے ہونے والے بچے کے باپ ہو۔"

"ارے باپ رے۔" چلّی اس طرح اچھل پڑا جیسے کرسی کے
دانت نکل آئے ہوں، وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبائے چچا کو
گھور رہا تھا۔ "آخر تم چاہتے کیا ہو چچا۔"

"میں ضدی والدین کو شکست دینا چاہتا ہوں اس کے علاوہ
اور کچھ نہیں۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"میں انہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بچے بھی سوچتا ہوا ذہن لے کر پیدا ہوتے ہیں، گو تمہاری ہی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں، لیکن تمہاری حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اگر تم لنگڑا کر چلتے ہو تو بچوں کو اس پر کیوں مجبور کرتے ہو کہ وہ بھی لنگڑا کر چلیں اور چلے، یہ بھی زیادہ نہیں ہے، ہم ان کے احترام میں لنگڑا کر بھی چل سکتے ہیں لیکن۔ یہ کیا ذرا ذرا سی بات پر لور کیا جائے، اب میرے والد صاحب ہی کی مثال لے لو۔ میں ان کے سامنے بلند آواز میں گفتگو نہ کروں، ہنسی آئے تو قہقہوں میں نہ تبدیل ہو سکے، بلکہ پیٹ ہی میں پھوٹتی رہے۔ ان کے سامنے پان نہ چباؤں، سگریٹ نہ پیوں۔ اگر وہ بے جا الزامات مجھ پر رکھیں تو میں ان کی تردید نہ کروں، اپنی صفائی نہ پیش کروں، مروں تو ان کے حکم سے، جیوں تو اُن کے حکم سے۔ یہ باپ نہیں بلکہ میرے خدا بننا چاہتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں ان کی وجہ سے عالمِ وجود میں آیا ہوں، لیکن نہ میں ان کے ذہن سے سوچ سکتا ہوں اور نہ میرا معدہ ان کی چبائی ہوئی غذا ہضم کر سکتا ہے پھر وہ مجھے اپنے ہی جسم کا ایک حصہ سمجھنے پر کیوں مصر ہیں۔ جس طرح ان کے ہاتھ پیر ان کے ذہن کے تابع فرمان ہیں اُسی طرح وہ مجھے بھی اپنے ہی ذہن کا تابع فرمان دیکھنا چاہتے ہیں، لیکن نہ ناممکن ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا میری بات؟"

"سمجھ رہا ہوں۔" چلی نے کہا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"میں نے ان کے جسم کا کوئی عضو بننے سے انکار کر دیا ہے۔"

رئیس الحسن بولا۔ "لہٰذا انہوں نے میرا خدا بننے سے انکار کر دیا۔ یعنی رزق بند۔ نہ میں گھر جا سکتا ہوں اور نہ میری وہ مدد کر سکتے ہیں۔ انہوں نے آج سے آٹھ سال پہلے کہا تھا کہ میں دَر دَر کی بھیک مانگتا ہوا ایک دن پھر ان کے در پر حاضری دوں گا اور تم دیکھ ہی رہے ہو کہ میں در در کی ٹھوکریں نہیں کھا رہا بلکہ پورے آٹھ سال سے اس کالج میں جما ہوا ہوں باپ نے خدا بننے سے انکار کر دیا تو میں نے شیطان کی دُم پکڑ لی... ہاہا۔ میں کیا بُرا ہوں چلّے۔"

"میرا دل اُلجھ رہا ہے تمہاری باتوں سے چچا۔" چلّی نے بسُور کر کہا۔

"تم گدھے ہو۔ مردوں کی طرح جینا سیکھو، شہنشاہ قسم کے والدین کو بتا دو کہ وہ دن لد گئے، جب تم گھوڑوں اور کتوں کی طرح بچے بھی پال لیتے تھے، یہ بیسویں صدی ہے، اگر تم نے بچوں کے جذبات کا احترام کرنا نہ سیکھا تو وہ نہ صرف تمہارے لئے ساری دُنیا کے لئے دَبال بن جائیں گے۔ مجھے دیکھ لو۔ محض میرے باپ کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے میری ذہانت غلط راستوں پر جا پڑی ہے اور اسے لکھ لو کہ میں ایک دن ساری دُنیا کے لئے فتنہ بن جاؤں گا۔ میری نظروں میں کسی کی بھی کوئی وقعت یا اہمیت نہیں رہ گئی ہے۔ میں اسی ابلیس کی طرح ساری دُنیا کو انگلیوں پر نچا سکتا ہوں جس نے آدم کو جنت سے نکلوایا تھا۔ ہاہا۔ . . ہاہا . . . آہا۔" رئیس کا چہرہ خوفناک ہوتا جا رہا تھا۔

"چچا خدا کے لئے۔" چلّی گڑگڑایا۔

"خدا کی بات نہ کرو، اس سے بھی آج کل میرے تعلقات اچھے نہیں

ہیں۔"

"ارے کُفر نہ بکو۔" چلّی نے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور رئیس خوفناک انداز میں ہنستا ہوا اس کے کمرے سے نکل گیا۔

آج رئیس الحسن نے کچھ کھل کر گفتگو کی تھی، لیکن کیا اس سے چلّی کی الجھنیں رفع ہوگئی تھیں۔ کیا وہ رئیس الحسن کے متعلق سب کچھ جان گیا تھا، کیا اُسے یہ معلوم ہو سکا تھا کہ رئیس الحسن اُس سے کیا چاہتا ہے۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ رئیس الحسن کی عنایات کا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ چلّی اپنے باپ سے صلح نہ کرے۔

بھلا اس قسم کے صلح و پیکار سے اُسے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

. . . . .

ایک دن زبیر نے اُسے مسٹر فیاض کا دعوت نامہ دیا۔ انہوں نے اسے اپنی لڑکی شاہدہ کی سالگرہ کی تقریب میں مدعو کیا تھا۔ دعوت نامہ چھپا ہوا تھا اور کارڈ کی پشت پر مسٹر فیاض نے تحریر کیا تھا۔

"پرنس اگر تم نے اس تقریب میں شرکت نہ کی تو مجھے بے حد دُکھ ہوگا۔ ضرور آؤ میں کوئی عُذر سُننے کے لئے تیار نہیں۔"

چلّی نے وہ دعوت نامہ چچا کے سامنے پٹختے ہوتے کہا "اب بتاؤ میں کیا کروں؟"

"میرے خیال میں بھی تمہاری شرکت بہت ضروری ہے۔"

شیخ کو اس کے اس اچانک فیصلے پر بڑی حیرت ہوئی وہ تو سمجھا تھا کہ رئیس الحسن سے اجازت ملنی مشکل ہو جائے گی۔ لیکن الجھنیں تو اس کا مقصد بن چکی تھیں۔ رئیس الحسن نے نہ صرف اُسے تقریب میں شرکت کی اجازت دے دی بلکہ ہلکے زیورات کا ایک سیٹ بھی

خرید دیا تھا۔ جو اُسے سر فیاض کی لڑکی کو تحفتاً پیش کرنا تھا۔

چلّی بے حد خوش تھا لیکن عین موقع پر جب زبیر نے دعوت میں شرکت کرنے سے انکار کر دیا تو چلّی کی سانس پھولنے لگی۔

"تم جاؤ۔" زبیر نے کہا "مجھے کچھ اور بھی ضروری کام کرنے ہیں اس لئے نہ جا سکوں گا۔"

"میں تنہا کیسے جاؤں گا؟"

"تم تنہا ہی جاؤ گے۔" رئیس نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"میں تو نہیں جاؤں گا۔"

"کیا؟" رئیس نے آنکھیں نکالیں۔

"چلا جاؤں گا۔" چلّی نے مردہ سی آواز میں کہا۔

اُسے اکیلے ہی جانا پڑا۔ ویسے اگر رئیس الحسن کا خوف نہ ہوتا تو وہ لاکھ برس نہ جاتا۔ وہ لاکھ چل نکلا ہو مگر پھر بھی شیخ چلّی ہی ٹھہرا۔ یہ سوچ سوچ کر اسے چکر آ رہے تھے کہ سر فیاض کے علاوہ اور کوئی جان پہچان والا نہ ہوگا، ظاہر ہے سر فیاض کے ساتھ شروع سے آخر تک رہنا کسی تقریب کے موقع پر ناممکن ہی ہوگا، پھر کیا وہ اکیلے مکھیاں مارے گا، کہیں وہ تنہا ہونے کی وجہ سے بالکل چغد نہ معلوم ہونے لگے۔

یہ اُس کی ایک بہت بڑی کمزوری تھی کہ وہ کسی مجمع میں تنہا جانے سے ڈرتا تھا۔ ایسے موقع پر اُسے بس ایسا ہی معلوم ہوتا تھا جیسے سب کی آنکھیں صرف اسی کی طرف نگراں ہوں اور جیسے مجمع کا ایک فرد اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہے گا "اے مسٹر! آپ کا یہ سوٹ بالکل بے ہنگم

سلا ہوا ہے اور یہ دیکھئے پتلون کی فال کیسی واہیات ہے اور کریز کیوں اِدھر اُدھر بھاگ رہی ہے، ٹائی کی گرہ آپ نے غلط لگائی ہے اور آپ کا یہ سوٹ بالکل بے موقع ہے۔ اس موسم میں آپ کو فلاں رنگ کا سوٹ پہننا چاہیئے تھا اور یہ آپ اتنے بدحواس کیوں نظر آ رہے ہیں کیا غلطی سے کوئی چمچہ یا فورک آپ کی جیب میں کود گیا ہے؟"

جیسے ہی اس کی ٹیکسی سر فیاض کی کوٹھی کے پھاٹک پر رُکی، چلّی کا دل بہت شدت سے دھڑکنے لگا اور پھر اُسے اس کا بھی ہوش نہیں رہ گیا کہ اسے کس نے کوٹھی کے اندر پہنچایا تھا، ویسے اُسے اتنا یاد ہے کہ جیسے ہی اس نے تقریب میں قدم رکھا تھا کسی نے اس کے نام کا اعلان کیا تھا۔

"پرنس چلّی پردیز، آف لوٹک لوٹا۔"

مگر اُسے حیرت تھی کہ اُس کے نام کا اعلان کیسے ہو گیا تھا، کیونکہ اُس نے تو کسی کو بھی اپنا نام نہیں بتایا تھا اور ابھی تک کسی شناسا سے بھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ سر فیاض کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔

پھر بہت دیر بعد یہ معمہ حل ہوا۔ دراصل دعوتی کارڈ اس سے پھاٹک ہی پر لے لیا گیا تھا اور دعوتی کارڈ پر اُس کا نام تحریر تھا۔ غالباً دعوتی کارڈ اس لئے لے لیا گیا تھا کہ مہمانوں کے ناموں کا اعلان کیا جا سکے۔

مگر چلّی سوچ رہا تھا کہ کاش اُس کے نام کا اعلان نہ کیا گیا ہوتا

کیونکہ یک بیک درجنوں آنکھیں اُس کی طرف اُٹھ گئی تھیں۔ اُس نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہاں دوپٹے اور غرارے بھی موجود ہیں، بس پھر کیا تھا اس پر اچھی خاصی بوکھلاہٹ طاری ہو گئی۔

اگر ٹھیک اُسی وقت سر فیاض سے ملاقات نہ ہو گئی تو شاید وہ اُلٹے پاؤں بھاگ نکلتا۔ "ہلو پرنس!" وہ لپک کر چلّی کی طرف بڑھے، چلّی نے مصافحہ کیا۔

"بڑے بے مروت ہو تم پرنس! اس دن کے بعد سے پھر ملے ہی نہیں۔"

"بس کیا بتاؤں جناب۔ فرصت ہی نہ ملی۔" چلّی مسکرایا۔

"آؤ، آؤ، میں تمہیں اپنے خاندان والوں سے ملاؤں سب بے حد مشتاق ہیں۔" سر فیاض اُسے ایک طرف کھینچتے ہوئے بولے، چلّی چپ چاپ ان کے ساتھ چلتا رہا۔

وہ اس قدر بوکھلایا ہوا تھا کہ خاندان والوں کا شمار نہیں کر سکا، البتہ وہ لڑکی بُری طرح اس کے ذہن سے چپک کر رہ گئی، جس کی سالگرہ تھی۔ چلّی کو سر فیاض کے خاندان والوں ہی کے پاس جگہ ملی۔ اِس طرح اُسے بار بار کنکھیوں سے شاہدہ کو دیکھنے کے مواقع نصیب ہوتے۔ ویسے اس پر بوکھلاہٹ اور شرمیلے پن کے دورے ایک ساتھ پڑتے تھے اور اس کا گوبھی سا چہرہ چقندر ہو کر رہ گیا تھا۔ لڑکیاں خصوصیت سے اُسے گھور رہی تھیں، لیکن یہ چیز چلّی کے لئے باعثِ مسرت نہیں تھی، کیونکہ جیسے جیسے اُسے گھورے جانے کا احساس ہو رہا تھا اس کی بوکھلاہٹ میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

خُدا خُدا کر کے سالگرہ کی رسومات شروع ہوئیں اور چلّی کی جان میں جان آئی کیونکہ اب سارے مہمان شاہدہ کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

رسومات کے اختتام پر تحائف کا دَور شروع ہوا۔ چلّی کے لئے یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کسی کو تحفہ پیش کرنے جا رہا تھا۔ شاہدہ تک پہنچنے میں کئی بار اُسے چکر آئے، کئی بار آنتوں نے پیٹ میں چکر لگائے، لیکن کسی نہ کسی طرح اُس نے تحفہ پیش کر کے دل ہی دل میں سجدۂ شکر ادا کیا۔

پھر چائے اور تفریحات کا دور شروع ہو گیا، شاہدہ کی سہیلی نے ایک واقعاتی رقص پیش کیا، جو بے حد دلچسپ اور چلّی کے لئے روح افزا ثابت ہوا۔ وہ اتنا محو ہو گیا کہ گرد و پیش کا ہوش نہ رہ گیا اور پھر شاہدہ کے گیتوں نے تو اس کا دم ہی نکال لیا۔ وہ بہت اچھا گاتی تھی، بعض مہمانوں کے بے حد اصرار پر اُس نے تین گیت سنائے۔

پھر مہمانوں کی واپسی کے وقت سر فیاض نے چلّی کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ اُسے بیحد خوشی ہوئی۔ وہ کچھ دیر اور شاہدہ کو دیکھنا چاہتا تھا جس کے مسکرانے کا انداز بہت دلکش تھا۔

چلّی رک گیا۔ شاہدہ اس کے قریب موجود تھی اور اسے اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ کسی دُوسری دُنیا سے پکڑ کر لایا گیا ہو۔

"بیگم بہت مشکل کام ہے۔" سر فیاض، لیڈی فیاض سے کہہ رہا تھا۔ "ذرا یہ عمر دیکھو اور یہ پختہ کاری! بڑے پُرانے شکاری بھی اس طرح شکار کرنے کی ہمت نہیں کر سکتے۔" لیڈی فیاض سر کو خفیف سی جنبش دے کر مُسکرائیں۔

"آؤ پرنس۔" سر فیاض نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "میں تمہیں اپنے شکار کئے ہوئے شیروں کی کھالیں دکھاؤں۔"

وہ ایک بڑے کمرے میں آئے جہاں چاروں طرف دیواروں پر بڑے
بڑے شیروں کی کھالیں نظر آرہی تھیں اور ایک کھال کمرے کے وسط میں فرش
پر بھی پڑی ہوتی تھی، دیواروں پر مختلف جگہوں میں قدیم اور جدید اسلحے
بھی موجود تھے۔

ان کے ساتھ دو آدمی اور بھی آئے تھے۔ یہ بھی سر نیاض ہی کی طرح
بوڑھے تھے اور ذی حیثیت معلوم ہوتے تھے۔

سر نیاض چلی کو پرانے ساخت کی بندوقیں دکھاتے ہوئے ان کی
تاریخ بتا رہے تھے اور اب چلی بھی چہکنے کے موڈ میں آگیا تھا "شکار
کے دوران میں مجھے کبھی کبھی عبرت بھی ہوتی ہے جناب۔" اس نے
کہا "ایک بار مجھے اطلاع ملی کہ ایک تالاب جو نرکل کی جھاڑیوں سے
گھرا ہوا ہے شیر کے شکار کے لئے بہت موزوں ہے کیونکہ آس پاس
کے شیر عموماً وہیں پانی پینے آیا کرتے تھے۔ میں نے جاکر موقع کا جائزہ لیا
تالاب بہت وسیع تھا اور اس کے کچھ حصے میں صرف دلدل تھی۔ دور
تک نرکلوں کی گھنی جھاڑیوں کے سلسلے پھیلے ہوئے تھے، اچانک میری
نظر دلدلی حصے کی طرف اٹھ گئی، جہاں ایک بھینسا آدھے دھڑ سے
دلدل میں پھنسا ہوا ڈکرا رہا تھا۔ پھر میں نے قریب ہی کسی شیر کی دھاڑ
سنی، دوسرے ہی لمحے میں وہ تالاب کے کنارے تھا۔ میں نے
رائفل سیدھی ہی کی تھی کہ اس نے جست لگائی اور سیدھا دلدل میں
پھنسے ہوئے بھینسے پر گیا۔ میں نے سوچا کہ اس کی بھی شامت ہی آئی
تھی۔ اب یہ بھی دلدل میں پھنس کر رہ جائے گا لیکن جناب میری
حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب وہ عجیب و غریب منظر میں نے دیکھا۔"

چلی سانس لینے کے لئے رکا اور سر نیاض نے مضطربانہ انداز میں
پوچھا "کیسا منظر۔"

"اب کیا عرض کروں۔ آپ حضرات یقین نہ کریں گے، کوئی بھی یقین
نہیں کر سکتا۔ مگر ان آنکھوں کو کیا کیا جائے جنہوں نے دیکھا ہی تھا ویسے
اگر میں کسی اور سے سنتا تو مجھے بھی یقین نہ آتا۔"

"اوہ! کچھ بتاؤ بھی؟"

"شیر نے بھینسے کو اپنی ٹانگوں میں دبا کر جو جست لگائی ہے تو پھر
بھینسے سمیت کنارے ہی پر نظر آیا۔ میں کانپ کر رہ گیا اور سوچا کہ
ایسے طاقتور جانور کو دو بالشت کی رائفل سے مار ڈالنا اس کی
زبردست توہین ہے۔"

سر نیاض کے دونوں ساتھی مسکرائے، چلی نے انہیں مسکراتے ہوئے
دیکھا اور کباب ہو کر رہ گیا۔

دفعتاً ایک آدمی نے زمین پر پڑی ہوئی شیر کی کھال کی طرف اشارہ
کرکے کہا۔ "ذرا ناپیے تو کنور صاحب، یہ شیر کتنا لمبا رہا ہوگا۔"

"کیسے ناپوں؟" چلی نے غصیلے لہجے میں کہا۔ اس بوڑھے نے
اپنی جیب سے ایک فٹ کا پیمانہ نکال کر اس کی طرف بڑھا
دیا۔

بیسویں صدی کے شیخ چلی اتنے ڈفر بھی نہیں ہوسکتے کہ ان
میں موقع شناسی کا مادہ سرے سے پایا ہی نہ جاتے، چلی سمجھ گیا کہ امتحان
مقصود ہے۔

اس نے آج تک زندہ شیر کی شکل نہیں دیکھی تھی، لیکن شیروں

کے شکاری تو دیکھے ہی تھے اور شیروں کے شکار کے متعلق ان کی گفتگو سُنی تھی اور وہ داستانیں سُنی تھیں جن کا تعلق شیروں کے شکار سے تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ شیر کو کس طرح ناپتے ہیں۔

اُس نے اسکیل سنبھال کر اُس کھال کو دُم سمیت ناپ ڈالا۔ دونوں بوڑھوں نے ایک دوسرے کی طرف خفت آمیز نظروں سے دیکھا۔

ویسے سرفیاض کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے انہیں ان بوڑھوں کی یہ حرکت بے حد گراں گزری ہو۔

چلّی نے بھی سوچا اب زیادہ بکواس نہ کرنی چاہیئے شاید سرفیاض اپنے دوستوں میں پہلے ہی سے اس کے قصیدے پڑھتے رہے ہیں ورنہ وہ بوڑھا اپنی جیب میں اسکیل کیوں لئے پھرتا۔

لیکن اُسے اس کا بھی اندازہ ہو گیا کہ ان کے متعلق چچا کا قول بالکل درست تھا۔

شاید اُن کے فرشتوں نے بھی کبھی شیر کا شکار نہ کیا ہو اور وہ کھالیں یقیناً خریدی ہوئی ہوں گی۔

. . . .

●

سرفیاض کے یہاں چلّی کی باقاعدہ طور پر آمدورفت شروع ہو چکی تھی چچا نے اس پر قطعی اعتراض نہیں کیا۔

چلّی اس سلسلے میں عموماً اُسے غلط ہی اطلاعات دیتا۔ کبھی یہ نہ کہتا کہ وہ روزانہ آتا جاتا ہے ہمیشہ پچھلے ہفتے کی خبر دیتا اور رئیس سے یہ سن کر اسے حیرت ہوتی کہ اُسے سرفیاض سے ملتے رہنا چاہیئے۔

"آخر کیوں؟" چلّی کہتا۔

"پہلے تو تم مجھے ان سے ملنے ہی نہیں دیتے تھے اب ان کے گھر بھیجتے ہو۔"

"پہلے کی بات چھوڑو" رئیس الحسن کہتا۔

"یہ تو مجھے اب معلوم ہوا ہے کہ سرفیاض بہت نیک آدمی ہیں۔"

"مگر خواہ مخواہ اُن سے کیوں ملوں؟"

"اس لئے کہ یہ چچا کا حکم ہے۔" رئیس الحسن نے غصیلی آواز میں کہا۔

"مقصد" چلی دانت پیستا۔

"میں بکواس نہیں سُننا چاہتا۔"

"کیا سر فیاض تمہیں جانتے ہیں۔"

"چلے اس چکر میں مت پڑو، جو کچھ میں کہوں کرتے رہو، کیا ابھی تک تمہیں میری کسی اسکیم سے کوئی نقصان پہنچا ہے، اگر پہنچا ہو تو میرا کہنا نہ مانو اگر نہیں پہنچا تو یہ سمجھ کر آئندہ بھی اس کا احتمال نہیں ہے، لہٰذا جو کچھ بھی کہوں کان دبا کر کرتے رہو۔"

"آخر مقصد ہی کیوں نہیں بتا دیتے۔"

"نہیں بتاؤں گا بحث کو طول نہ دو، ورنہ پچھتاؤ گے۔"

چلی خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا۔

دوسری طرف سیشنج چلی کو ایک نیا روگ لگتا جا رہا تھا۔ یہ تھا عشق،

شروع میں اسے شاہدہ کی صرف مُسکراہٹ پسند آئی تھی۔

پھر آہستہ آہستہ یہ خیال اُس کے ذہن میں جڑ پکڑتا رہا وہ جس انداز میں چلتی ہے اور چلتے وقت سر میں جو ہلکی سی جنبش پیدا ہوتی ہے، اس کی مثال کسی دوسری جگہ ہرگز نہیں مل سکتی۔

یعنی اُس کے چلنے کا انداز دنیا سے نرالا تھا۔

پھر اس کی آنکھیں بھی اسے انگوری شراب کی بوتل معلوم ہونے لگیں اور اس کی انگڑائیوں میں اُسے ستار کے نغمے سُنائی دینے لگے

مگر ان سب سے لطف اندوز ہونے کے لئے اسے سر فیاض کے ساتھ دو چار بازیاں شطرنج کی ضرور کھیلنی پڑتی تھیں۔

صرف یہی نہیں بلکہ دیدہ و دانستہ ہار کر سر فیاض کے مکھن بھی

لگانا پڑتا تھا۔

آخر ایک دن چچا نے اُسے چاند سے باتیں کرتے دیکھ لیا۔ چلی چاند سے کہہ رہا تھا۔

"تو اِس وقت وہ بھی تمہیں دیکھ رہی ہوں گی۔ پیارے چاند میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ تم گواہ رہنا کہ میری گرم آہیں۔ نہیں ٹھنڈی، پتہ نہیں کیا کہتے ہیں۔ مگر میں بہت بیتاب ہوں۔ اُن سے کہہ دو کہ میں تڑپ رہا ہوں۔"

"کہہ دیا جائے گا۔" چچا نے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر کہا اور چلی اچھل پڑا۔

چچا نے پوچھا۔

"کیا بکواس کر رہے تھے؟"

"کچھ نہیں؟" چلی غرایا۔ محویت ٹوٹنے پر اُسے غصہ آگیا تھا۔

"پاگل ہو گئے ہو شاید۔ تنہائی کی بکواس کے یہی مطلب ہوتے ہیں۔"

"تمہاری بلا سے پیچھا چھوڑو میرا۔"

رئیس ہنسنے لگا۔ پھر اُس نے چلی کی پیٹھ سہلا کر کہا۔

"چچا سے کوئی بات نہ چھپاؤ ورنہ ہو سکتا ہے کہ کسی چکر میں پڑ کر کچھ گنوا بیٹھو۔ میں تمہیں کئی دنوں سے کچھ کھویا کھویا سا دیکھ رہا ہوں۔"

چلی تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"ہاں میں کھو گیا ہوں لیکن اس بار میں اپنی جان دے دوں گا۔"

"آخر بات کیا ہے کچھ بکو بھی۔"

چلی نے ایک بہت لمبی آہ کے بعد کہا۔

"تم نے پچھلی بار مجھے حقیقت سے عشق نہیں کرنے دیا تھا، لیکن اس بار میں تمہاری پرواہ نہیں کروں گا خواہ تم میری گردن ہی کیوں نہ اُڑا دو۔"

"عشق۔" چچا نے بُرا سا منہ بنایا۔

"ہاں!"

"تم کیا جانو، عشق کسے کہتے ہیں۔"

چلی نے کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ نہ ملے۔

"ہوں! تو تم پر پھر اس بیماری کا حملہ ہوا ہے۔" رئیس الحسن نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"خیر! وہ تو ایک نہ ایک دن بھگتنا ہی پڑتا ہے، اب کس سے عشق ہوا ہے تم کو؟"

"کیوں بتاؤں۔" چلی مسکرا کر لچکتا ہوا بولا۔

"نہیں ضرور بتاؤ فرہاد کے نواسے تاکہ میں تمہیں کوئی مفید مشورہ دے سکوں۔"

"لعنت ہے مشورہ قبول کرنے والے پر" چلی بگڑ گیا۔

"تم اس معاملے میں مجھے مجبور نہیں کر سکو گے، میں اپنی جان دے دوں گا۔ اجی واہ۔ اب میں عشق کروں تو تمہاری مرضی سے۔ ہائے وہ مسکراہٹ، میں مر جاؤں گا چچا۔ ہائے وہ چلنے کا انداز، میں فنا ہو جاؤں گا چچا۔ خدا کے لئے مجھے اس سے نہ روکنا۔ مجھے تم سے بھی محبت ہے۔ اس لئے ڈرتا ہوں کہ کہیں دو محبتیں آپس میں ٹکرا نہ

جائیں۔ خدا کے لئے چچا میری گزارش سن لو۔"

"چلے"

"ہاں چچا۔"

"ابے میں پوچھ رہا ہوں کہ تجھے عشق کس سے ہوا ہے اور تو خواہ مخواہ ادھر اُدھر کی بکواس میں وقت برباد کر رہا ہے۔"

"شاہدہ" چلی دردناک آواز میں بولا۔

"یہ کون ہے؟"

"مسٹر فیاض کی لڑکی۔"

"اوہ۔ ابے چلی یہ کیا کیا تو نے یہ مسٹر فیاض کی اکلوتی لڑکی ہے۔"

"اگر وہ اکلوتی ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے اگر دو چار ہوتیں تب بھی فرق نہ پڑتا۔"

رئیس الحسن کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ چلی بڑبڑاتا رہا۔

"پتہ نہیں۔ وہ بھی۔ اے چچا یہ تو بتاؤ کیا وہ بھی میرے لئے تڑپ رہی ہوگی؟"

"پوچھتا ہوں مسٹر فیاض سے فون پر۔"

"کیا؟" چلی اچھل پڑا۔

"یہی کہ اگر وہ بھی تڑپ رہی ہو تو فوراً اطلاع دی جائے تاکہ میں تمہیں مطمئن کر سکوں۔"

"ارے باپ رے۔۔۔ فون نہیں۔۔۔ مسٹر فیاض سے پوچھو گے مطلب یہ کہ۔۔۔"

"مطلب کچھ بھی نہیں! کیا تم نے سرنیاس سے بتایا تھا کہ تمہیں شاید سے عشق ہوگیا ہے؟"

"ارے کیسی اُلٹی کھوپڑی کی باتیں کر رہے ہو بھیا سرنیاس کو بتاتا!" چلی جھلا گیا۔

"کیوں نہ بتاؤ؟"

"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے شاید۔"

"چلے۔"

رئیس نے ٹھنڈی سانس لی، کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔

"فطرت ہمیں خوب اُلو بناتی ہے۔ تمہیں میری سائیکل استعمال کرنی ہوگی تو مجھ سے اجازت طلب کرو گے، لیکن عشق کر ڈالتے ہو والدین سے پوچھے بغیر۔"

"اے خاموش رہو۔" چلی بگڑ گیا "تم میری محبوبہ کو سائیکل سے تشبیہ دے کر اس کی توہین نہیں کر سکتے۔"

"سائیکل سے بھی بدتر۔ کیونکہ پرانی سائیکل بھی کچھ نہ کچھ دام دے ہی نکلتی ہے لیکن نظروں سے اُتری ہوئی محبوبہ کا کوئی مصرف نہیں ہوتا۔"

"میں اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لوں گا۔"

"خیر ختم کرو۔ اب تمہیں عشق ہو ہی گیا ہے، اس لئے کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

"یعنی؟"

"مطلب یہ کہ تمہارا عشق ناکام نہ ہو۔"

"چچا دی گریٹ۔ زندہ باد" چلی حلق پھاڑ کر چیخا۔

"مگر اس کے رویے کے متعلق بھی تو کچھ بتاؤ!"

"میں تم سے یہی پوچھ رہا تھا کہ کیا وہ بھی میری ہی طرح بے قرار ہوگی۔"

"چلے! یہ یکطرفہ محبت معلوم ہوتی ہے۔" چچا اسے گھور کر بولا۔

"یکطرفہ کا کیا مطلب؟"

"یعنی ابھی تم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ بھی تم سے عشق کرنے کا ارادہ رکھتی ہے یا نہیں۔"

"ہاں یہ مجھے نہیں معلوم۔"

"تب تو تم چاند ہی سے باتیں کرو، پیارے چلے۔ وہ تمہارا پیغام اُس تک ضرور پہنچا دے گا۔ گڈ نائٹ۔"

"ارے سنو تو سہی چچا، خدا کے لئے دو منٹ بیٹھ جاؤ۔"

"کیا کروں گا بیٹھ کر۔" رئیس نے غصیلے لہجے میں کہا۔ "میں نے تم پر جتنی محنت کی تھی مفت میں برباد ہوئی، تم اس قابل ہو کہ تمہیں گولی مار دی جائے۔"

"میں نے کیا کیا ہے؟"

"ایک بہت بڑی حماقت تم سے سرزد ہوئی ہے، وہ یہ کہ تم نے اسے اپنی طرف متوجہ کئے بغیر ہی اس سے عشق کر ڈالا اور اب مجھ سے پوچھتے ہو کہ وہ بھی تمہارے لئے تڑپ رہی ہوگی۔"

"پھر میں کیا کرتا؟"

"کیا وہ کبھی تم سے گفتگو کرتی ہے۔"

"ہاں کبھی کبھی مزاج پرسی کرتی ہے۔"

"اس میں کوئی دوسرا آدمی تو دلچسپی نہیں لے رہا۔"

"یہ کیا میں جانوں ؟"

"ابے چلے کبھی تیرے باپ کو بھی عشق کی توفیق ہوئی تھی یا تو ہی چلا ہے فرہاد کی قبر پر لات مارنے ۔"

"پتہ نہیں ۔" چلی سر ہلا کر بولا۔ "شادیاں تو انہوں نے کئی مدد کی تھیں مگر کسی کو طلاق دے دی اور کسی کو گزارا دے کر چھوڑ دیا۔ آج کل صرف تین بیویاں ہیں ۔"

"میں پوچھ رہا ہوں کہ تم عشق کر کے کرو گے کیا ؟"

"میرے پاس اتنا مغز نہیں ہے کہ تمہاری باتوں کا جواب دے سکوں ۔" چلی نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

"عشق کرنا ہے تو پہلے یہ معلوم کرو کہ کوئی اور تو اس میں دلچسپی نہیں لے رہا اور ہاں اُسے بھی تمہاری پرواہ ہے یا نہیں اور تم کچھ گانا وانا بھی جانتے ہو یا نہیں ۔"

"گانا ! ہاں میں بالکل سہگل کے اسٹائل میں گا سکتا ہوں ۔"

"گڈ۔ یہ اچھی خبر ہے کچھ گاؤ سماں بڑا سُہانا ہے !!"

"ارے گاؤں ہی ہی ہی ۔" چلی شرمیلے انداز میں ہنسا۔

"چلو سناؤ کچھ ورنہ اُسے کیسے سُنا سکو گے ۔"

چلی نے بدقت تمام اسے دیوداس کا گیت "بالم آن بسو مورے من میں ۔" سنایا۔

"یہ دقیانوسی ہے ۔" چچا نے کہا۔

"کچھ جدید چیزیں یاد کرو ۔"

چچا کی تجویز پر چلی اونگھنے لگا، اسے اب نیند آنے لگی تھی اس لئے وہ چاہتا تھا کہ اب چچا اٹھ کر چلا جائے۔

چچا کی ہدایت پر چلی اپنا زیادہ تر وقت عشق کرنے میں گزارنے لگا کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی نہیں رہ گیا تھا۔

سر فیاض کی کوٹھی میں چار بجے شام سے نو بجے رات تک شطرنج ہوتی اور اس کے بعد بھی اگر سر فیاض غپ لڑانے کے موڈ میں ہوتے تو اکثر گیارہ بھی بج جاتے، وہ شطرنج کھیلتا اور ٹھنڈی آہیں بھرتا۔ ٹھنڈی آہیں یوں بھرنی پڑتی تھیں کہ اسے سر فیاض پکڑ لیتے تھے اور محبوبہ دلنواز برابر ہی کے کمرے میں موجود ہوتی لیکن چلی اکثر دیدار سے بھی محروم رہ جایا کرتا تھا مگر "بہر ملاقات" جو "تقریب" ہاتھ آئی تھی وہ یہی بیچارگی شطرنج ہی تھی۔ سر فیاض لپٹ لگنے والے کھلاڑیوں میں سے تھے، اس لئے شطرنج کے مقابلے میں لوگ ان سے دور بھاگتے تھے۔ چلی میں انہیں یہی ایک بہت بڑی صفت نظر آئی تھی کہ وہ ان کی دانست میں جم کر کھیلنے والوں میں سے تھا۔ اِدھر چلی محض شاہدہ کی وجہ سے یہ بوریت بھی برداشت کرتا تھا، ورنہ بعض اوقات تو اس کا دل چاہتا کہ سر فیاض کو پٹخ کر اُن کے منہ میں مُہرے ٹھونسنا شروع کر دے اور اس وقت تک ٹھونستا رہے جب تک دم نہ نکل جائے، لیکن بس وہ سوچ ہی سکتا تھا کیونکہ ایسا کر گزرنے سے پہلے اُسے اپنی محبت کی لاش پہ پاؤں رکھنا پڑتا۔

لہٰذا وہ چپ چاپ شطرنج کھیلتا اور محبت کی پرورش کرتا رہا۔ ویسے اسے یقین ہو گیا تھا کہ فی الحال شاہدہ کا اور کوئی اور امیدوار نہیں ہے۔

اپنے علاوہ اس نے ابھی اور کسی نوجوان کو سر فیاض کی کوٹھی میں نہیں دیکھا تھا۔

لیکن اس کی وجہ بھی اُسے بعد کو معلوم ہوئی۔

شاہدہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی اور اگر کوئی شامت کی ماری مکھی بیٹھ ہی جاتی تھی تو اُسے بے حد پچھتانا پڑتا تھا۔ غالباً اس شام ناک پر بیٹھی ہوئی مکھی اُڑانے کے سلسلے میں ایک لاجواب قسم کے سینڈل کی رسائی پرلس چلی کی ناک تک ہوگئی تھی۔

وہ برآمدے میں سے گزر رہا تھا کہ اچانک ایک چمچماتا ہوا سینڈل اس کی ناک پر پڑا اور ساتھ ہی اس نے شاہدہ کی چیخ سنی غالباً وہ کسی ملازم پر گرج برس رہی تھی۔ نوکر بے تحاشا دوڑتا ہوا کمرے سے نکلا اور چلی کے قریب سے نکل گیا' جو ناک دبائے کھڑا تھا لہٰذا دوسرے سینڈل نے بھی اسی کی عزت افزائی پر اکتفا کیا۔

یہ سینڈل بائیں کنپٹی پر پڑا تھا۔

اگر اس کنپٹی پر بھی کوئی ناک ہوتی تو اسے بھی نکسیر سے پھوٹنے کے اندوہناک تجربے سے دوچار ہونا پڑتا۔

چلی ناک دبائے کھڑا رہا اور خون کی بوندیں فرش پر ٹپکتی رہیں شاہدہ نے یہ سچویشن دیکھی تو اپنے کمرے کا دروازہ ہی بند کر لیا۔ چلی سمجھا کہ شاید وہ جھپٹ کر اس کی طرف آئے گی۔ کچھ دیر سر سہلائے گی ہوسکتا ہے زخمی ناک پکڑ کر خود ہی دھونے بیٹھ جاتے اور پھر . . . مگر چلی کے خواب' بند ہو جانے والے دروازے سے ٹکرا کر چکنا چُور ہو گئے۔

اُس کا دل چاہا کہ دھاڑیں مار مار کر روئے یا پھر گانا شروع کر دے۔

مصرع میرا نام عبدالرحمٰن
پستے والا میں ہوں پٹھان

لیکن اس کے حلق سے آواز ہی نہ نکل سکی۔

سر فیاض بھی شاید آج گھر پر موجود نہیں تھے۔ اس لئے اُسے بے نیل و مرام واپس آنا پڑا۔

چچا نے یہ کہانی سُنی تو دل کھول کر ہنسا بھی اور خفا بھی ہوا اور چلی کا دل چاہا کہ اسی وقت پاگل ہو جائے' اسی چچا کی بدولت اسے شاہدہ سے عشق ہوا تھا اور یہی ناہنجار اب اس طرح ہنس رہا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے بگڑ کر کہا۔ "میں زندہ رہوں یا نہ رہوں۔"

"میں تمہیں زندہ رہنے ہی کے گُر سکھا رہا ہوں۔ ابھی سیکھ لو ورنہ چچا کی موت کے بعد پچھتاؤ گے۔"

چلی کچھ نہ بولا وہ اپنی ناک سہلانے لگا تھا۔

"اب میرا مشورہ ہے کہ تم کچھ دن سر فیاض سے مت ملو' بلکہ کسی طرح یہ خبر کوٹھی تک پہنچا دو کہ تمہاری ناک میں زہر باد ہو گیا ہے۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"اس کے دل میں تمہاری محبت انگڑائیاں لینے لگے گی' وہ سوچے گی کہ اس کی وجہ سے تمہاری ناک سڑنے کی نوبت آئی ہے۔"

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو' چچا؟" چلی نے گلوگیر آواز میں پوچھا۔

"کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے۔"

چلی ایک ہفتے تک سرفیاض سے نہیں ملا۔ زبیر نے اُسے بتایا تھا کہ ناک کے زہرباد کی کہانی سرفیاض تک پہنچ گئی ہے، ظاہر ہے کہ یہ کہانی زبیر کی زبانی ان تک پہنچی ہوگی چنانچہ اس دوران میں چلی جب بھی باہر نکلتا اس کی ناک پر پٹی ضرور موجود ہوتی۔ یہ بات اس کی عقل نے بھی ہضم کر لی تھی کہ اس کہانی سے شاہدہ کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو سکتا ہے۔

پھر ایک دن شہر میں شاہدہ سے مڈبھیڑ ہو ہی گئی، چلی ایک دکان سے نکل رہا تھا۔ اور شاہدہ نے اسی وقت فٹ پاتھ سے لگا کر کار روکی تھی۔ وہ خود ہی اپنی چھوٹی آسٹن ڈرائیو کرتی تھی۔ غالباً اُسے بھی اس وقت شاپنگ کرنی تھی لیکن چلی کو دیکھ کر اس نے گاڑی سے اترنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔

چلی اُسے دیکھ کر بوکھلا گیا اور اس کے دونوں ہاتھ بے تحاشا ناک پر جم گئے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جیسے دُم کی عدم موجودگی میں ناک ہی دبا کر بھاگ نکلے گا۔

شاہدہ نے اُسے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا اور اس کی بدحواسی بڑھ گئی، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کی طرف جائے یا جدھر سینگ سمائیں سرپٹ دوڑتا چلا جائے۔

آخر کار سینگ ہی سمائے اور وہ ایک طرف بھاگ نکلا۔ سڑک سے گلی میں مُڑ گیا اور پھر دوسری طرف کی سڑک پر نکلا ہی تھا کہ بجلی کے کھمبے سے ٹکرا کر سچ مچ ناک پر آفت مول لے لی۔

بجلی کے کھمبے سے ٹکرانے کی وجہ بھی شاہدہ ہی بنی تھی، شاید اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ وہ گلی میں گھس کر اسی سڑک پر آئے گا۔

لہٰذا اس کی گاڑی بھی وہیں پہنچ گئی

اب چلی دونوں ہاتھوں سے ناک دبائے ہوئے فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا تھا۔ شاہدہ کار روک کر نیچے اتر آئی اور چلی کا بازو پکڑ کر بولی۔

"پرنس، پرنس، اٹھو، تم بھاگے کیوں اوہ! اوہ پھر تمہاری ناک سے خون بہنے لگا ہے۔ ارے اس میں تو ٹیک ہو گیا تھا شاید۔ اٹھو! میں تمہیں ہسپتال لے چلوں"

چلی کے سارے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ آج پہلی بار زندگی میں کسی غیر عورت نے جسم کو ہاتھ لگایا تھا۔

وہ اٹھا تو مگر چلتے وقت اس طرح لڑکھڑا رہا تھا جیسے اپنی بساط سے زیادہ پی گیا ہو۔

اُس نے اُسے اگلی ہی سیٹ پر بٹھایا اور اپنا رومال پیش کرتی ہوئی بولی۔

"لو۔ یہ رومال لو! شاید تمہارا رومال ناکافی ہو، خون بہت نکل رہا ہے"

جہنم میں گیا خون! چلی نے سوچا مگر میں اپنی سانسوں پر کیسے قابو پاؤں اور اس دھڑکن کا کیا ہوگا جس نے دل کو ہوائی جہاز بنا کر رکھ دیا ہے۔

کار چل پڑی اور شاہدہ نے چلی سے پوچھا۔

"تم بھاگے کیوں تھے پرنس؟"

"گگ... کچھ... نہیں... کوئی بات نہیں" وہ ہانپتا ہوا بولا۔

"مجھے اُس دن کے واقعے پر افسوس ہے۔ بس غلطی سے یہ واقعہ ہو گیا تھا۔"

چلی نے ناک پر بندھی ہوئی پٹی ٹٹول کر اطمینان کی سانس لی مگر وہ اسے اطمینان کی سانس سمجھنے پر تیار نہیں تھا کیونکہ شاہدہ تو اسے ہسپتال لے جارہی تھی۔ وہاں یقینی طور پر پٹی کھول ڈالی جاتی پھر کیا ہوتا؟

چلی کے دل کی دھڑکن اور زیادہ تیز ہوگئی۔ پٹی کھلنے پر زہر باد والی کہانی کا کیا حشر ہوتا؟

اس نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ہسپتال تک نہ پہنچنے پائے لیکن الفاظ ذہن سے حلق میں اترتے اور وہیں دم توڑ دیتے۔ زبان تک پہنچنے کی نوبت ہی نہ آتی۔

بہرحال وہ ہسپتال تک پہنچ ہی گیا۔ اب یہاں تو کسی قسم کے عذر کی گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی۔

مگر اس وقت شیخ چلی بے حد خوش ہوا اور دل ہی دل میں سجدۂ شکر بجا لایا جب ڈاکٹر اسے آپریشن تھیٹر کی طرف لے چلا اور شاہدہ بھی چلنے پر مُصر نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر نے اُس سے پٹی کے متعلق استفسار کیا اور چلی نے یہ کہہ کر اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ خون بند کرنے کے لئے جلدی میں پٹی باندھ دی گئی تھی۔

"مگر ان محترمہ نے تو کہا تھا کہ سپٹک ہوگیا ہے اور اُسی حالت میں دوبارہ ناک ہی پر چوٹ لگ گئی تھی۔"

ڈاکٹر نے کہا اور چلی بوکھلا گیا لیکن ہاتھ پیر تو مارنے ہی تھے، ورنہ

بیڑہ شاید وہیں غرق ہوجاتا۔

اُس نے کہا "آپ کے سننے میں فرق آیا ہوگا۔ انہوں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ کہیں سپٹک نہ ہوجائے۔"

"ارے نہیں سپٹک کا اندیشہ نہیں ہے۔"

ڈاکٹر نے مسکرا کر کہا تھا اور چلی مطمئن ہوگیا تھا، مگر پھر ایک دشواری آپڑی۔ بھلا خون بند ہوجانے کی صورت میں ڈاکٹر کو کیا پڑی تھی کہ وہ ناک پر دوبارہ پٹی باندھتا، پہلے جو پٹی بندھی ہوئی تھی کھول کر غلاظت کی بالٹی میں ڈال دی گئی تھی۔

چلی نے پٹی کے لئے اصرار کیا۔

"نہیں جناب! اب اس کی ضرورت نہیں ہے اور پھر اگر بیرونی چوٹ ہوتی تو ڈریسنگ میں مضائقہ نہیں تھا، لیکن ایسی صورت میں فضول ہے۔"

چلی اپنی خیالی دُم ہلاتے ہوئے وہاں آیا جہاں شاہدہ اس کی منتظر تھی۔

اس نے چلی کی ناک کا بنظرِ حیرت جائزہ لیا، لیکن کچھ بولی نہیں۔

دونوں پھر کار میں آ بیٹھے۔

"مجھے تو نہیں معلوم ہوتا کہ تمہاری ناک میں کبھی زہر دبا ہوا ہو۔" شاہدہ نے کہا۔

"نن۔۔۔ نہیں۔" چلی ہکلایا۔

اس نے سوچا کہ اب جھوٹ بولنے سے کام نہیں چلے گا۔ اُسے

سب کچھ کہہ دینا چاہیئے۔ لہٰذا وہ سچ بولنے کے سلسلے میں اور زیادہ ہکلانے لگا۔

پوری بات سن کر شاہدہ بڑے دلآویز انداز میں مسکرائی اور بولی۔

"تو آخر ایک غلط بات مشہور کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

چلی نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی اُسے اس سے بجید خوف معلوم ہونے لگا ہے، اِس لئے وہ علالت کا بہانہ کرکے روزانہ کی حاضری سے باز رہنا چاہتا تھا۔

"ڈیڈی تمہیں بے حد یاد کرتے ہیں؟" شاہدہ نے کہا "تم اتنے بہادر ہوکر شیروں کو للکار کر اُن کا شکار کرتے ہو، پھر اتنے ڈرپوک کیوں ثابت ہو رہے ہو؟"

"دُنیا میں آپ کے علاوہ کسی سے ڈر نہیں معلوم ہوتا۔" چلی نے شرما کر کہا۔

"آخر کیوں؟"

"پتہ نہیں کیوں؟ وہ دیکھئے بات یہ ہے۔۔۔ وہ چاند جو ہے نا ۔۔۔ میں گھنٹوں اس سے آپ کی باتیں کیا کرتا ہوں۔"

"چاند!" شاہدہ نے حیرت سے کہا "میں نہیں جانتی یہ چاند کون ہے؟"

"چاند!" ارے آپ چاند نہیں جانتیں۔۔۔ یعنی کہ مون ایم ڈبل او این ۔۔۔ مون۔۔۔"

"تم چاند سے میری باتیں کرتے ہو؟" شاہدہ کے لہجے میں حیرت اب بھی باقی تھی۔

"جی ہاں!" چلی نے پھر شرما کر سر جھکا لیا۔

اور پھر شاہدہ اسے چھیڑنے لگی۔

چلی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اظہارِ عشق کے لئے کون سا طریقہ اختیار کرے۔ پہلے اس نے ارتھمیٹک کے سارے قاعدے کھنگالے، پھر الجبرا کے جیومیٹری کے لیکن کامیابی نہ ہوئی۔

یکے بعد دیگرے وہ ان سارے مضامین کا جائزہ لیتا چلا گیا، جو آج تک اس نے پڑھے تھے، آخر ہسٹری پر دماغ نے جھٹکا کھایا۔

"ہاہا" اس نے بے خیالی میں قہقہہ لگا کر نعرہ لگایا "جہانگیر۔ انارکلی!"

"ہائیں! کیا مطلب؟" شاہدہ بے ساختہ چونک پڑی۔

"میں جہانگیر، تم انارکلی۔"

"گدھے۔۔۔ بدتمیز۔۔۔ بیہودے، بے شرم، اترو! فوراً اترو گاڑی سے۔" وہ آپے سے باہر ہوگئی۔

"ارے بپ۔۔۔ باپ"۔ چلی بوکھلا گیا اور اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

شاہدہ نے گاڑی روک دی تھی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح کار کا دروازہ کھولا اور نیچے اترنے کے لئے جھکا ہی تھا کہ پیچھے سے ایک ٹھوکر بھی پڑی جس کی وجہ سے اترنے میں نہ صرف آسانی ہوگئی بلکہ ناک بھی تیسری بار "شہید عنزہ" کہلائی اور کار تو کب کی جا چکی تھی۔

چلی کے عشق کی ناکامی کی داستان سن کر چچا کی برہمی کی حد نہ رہی۔ اس نے کہا کہ اسے ڈوب مرنا چاہیئے تھا اور چلی بھی سچ مچ ڈوب مرنے ہی کے امکانات پر غور کرنے لگا۔ ساتھ ہی اس نے یہ محسوس کیا، تیس الحسن بے حد متفکر نظر آنے لگا ہے۔

اس رات چاند بھی نہ نکلا تھا کہ چلی اسی سے شکوے کرتا۔ اس لئے وہ تاروں کو گن گن کر کبھی ڈھائی سے ضرب دیتا اور کبھی سوا پانچ سے۔ لیکن اس شغل کے باوجود بھی اسے نیند آ ہی گئی اور وہ جی بھر کے سویا اور دوسری صبح اٹھ کر اپنے سر پر پانچ جوتے جمائے، کیونکہ یہ حرکت عاشقانہ روایات کے خلاف تھی۔ بھلا عشق میں ناکامی کے بعد نیند کا کیا کام؟

وہ کئی دنوں تک بڑی شدت سے بور ہوتا رہا۔

نہ جانے کیوں رئیس الحسن نے بھی اب اس سے بے اعتنائی برتنی شروع کر دی تھی۔ اس کی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آ سکی۔ اس نے پوچھا بھی، لیکن جواب نہ ملا۔ خاموشی کا انداز خفگی ہی کا سا تھا۔

"اے چچا! یہ کیا مصیبت ہے . . . تم بھی خفا ہو . . . اور وہ جانِ بہار بھی خفا . . . پھر کیا . . . میں خودکشی کر لوں؟" چلی نے روہانسی آواز میں پوچھا۔

"تمہارے لئے یہی مناسب ہے۔" رئیس نے سرد لہجے میں جواب دیا۔

"آخر کوئی بات بھی ہو۔ خفگی کی وجہ بھی تو بتاؤ۔"

"کچھ نہیں۔ میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ تم سولہویں صدی کے شیخ چلی سے مختلف نہیں ہو۔ میں سمجھا تھا کہ ممکن ہے بیسویں صدی نے تمہاری کھوپڑی کے کل پرزے درست کر دیئے ہوں، لیکن مجھے بے حد مایوسی ہوئی۔"

"مگر تمہیں مایوسی کیوں ہوئی ہے عشق تو میں نے کیا تھا۔"

"چلئے! بکواس بند کرو، ورنہ میں تمہیں اٹھا کر باہر پھینک دونگا۔

میں تمہیں صرف پندرہ دن کی اور مہلت دیتا ہوں، اس کے بعد بھی اگر تم اسے اپنے عشق میں گرفتار نہ کر سکے تو میں تمہیں اس شہر کی سڑکوں پر ٹھوکریں کھاتا ہوا دیکھوں گا۔"

"آخر کیوں؟"

"کچھ نہیں۔" رئیس نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

چلی کی کھوپڑی گردش کرنے لگی جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اس نے دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھام کر گانا شروع کر دیا۔

؎ میرے دل میں لگی ہے چوٹ نہ کرنا کھوٹ

رسیلے بالم . . .

ہو وُوُ . . . رسیلے بالم!

دو ایک دن اور گزرے۔ اب اس کی حالت بہت غیر ہوتی جا رہی تھی۔

وہ بازار کی طرف نکل جاتا اور گھنٹوں اس بجلی کے کھمبے سے لپٹا کھڑا رہتا جس سے ٹکرا کر دوسری بار نکسیر پھوٹی تھی۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ شاہدہ نے ٹھیک اسی کھمبے سے لگا کر اپنی کار روکی اور چلی بے تحاشا بھڑک گیا۔

"ٹھہرو۔" شاہدہ نے اُسے للکارا اور زمین نے اس کے پیر پکڑ لئے ورنہ وہ پھر وہاں سے نو دو گیارہ ہو گیا ہوتا۔

شاہدہ نیچے اتر آئی۔ اس کی آنکھیں غصے سے سُرخ ہو رہی تھیں۔

"چلو بیٹھو۔" اس نے دانت پیس کر کار کی طرف اشارہ کیا۔

"مم . . . میں . . . وہ . . . دیکھئے ۔"

"چلو" اس نے آنکھیں نکالیں اور چلّی دونوں ہاتھوں سے ناک دبائے ہوئے کار میں جا بیٹھا ۔

کار چل پڑی ۔ چلّی بُری طرح ہانپ رہا تھا ۔

"تم مجھے بدنام کرتے پھر رہے ہو ؟" شاہدہ غرّائی ۔

چلّی نے بھی کچھ کہنا چاہا، لیکن آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی ۔ ویسے اس کے دونوں ہاتھ ناک ہی پر تھے ۔

شاہدہ کہتی رہی ۔

"میں نہیں سمجھ سکی کہ تمہیں اس کی جرأت کیسے ہوئی ۔ کالج میں تمام لڑکیوں تک یہ بات کس نے پہنچائی ہے ۔ تم کو کس الو کے پٹھے نے کہا تھا کہ مجھ سے عشق شروع کر دو ۔"

"اب میں زہر پی لوں گا ؟" چلّی بھرائی ہوئی آواز میں بولا ۔

"لیکن میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہے کہ آپ کے کالج میں یہ بات کس نے پہنچائی ہے ۔ میں تو صرف چاند سے آپ کی باتیں کرتا ہوں ۔ جب چاند نہیں ہوتا تو گھٹ گھٹ کر رہ جاتا ہوں . . . مگر . . ."

"تمہیں مجھ سے عشق ہو گیا ہے کیوں ؟"

"میں کیا کروں کوشش کر کے نہیں کیا ۔ پتہ نہیں کیسے خود بخود ہو گیا ہے ۔" چلّی نے رو دینے والی آواز میں کہا اور پھر اس نے سچ مچ رونا شروع کر دیا ۔

"ارے . . . ارے . . . ہائیں . . . تم نے رونا کیوں شروع کر دیا خاموش رہو . . . دیکھو . . . میں مردوں کی آنکھوں میں آنسو

نہیں دیکھ سکتی . . . خدا کے لئے چُپ رہو . . . ورنہ میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا . . . چپ رہو . . . پلیز . . . پرنس چلّی . . . او . . . ڈیئر ! اب چُپ بھی رہو ۔"

اب تو چلّی کے ہچکیاں لگ گئیں "ڈیئر" نے جلتی پر تیل کا کام کیا ۔ آتشِ عشق اس زور سے بھڑکی کہ چلّی نے ڈیش بورڈ سے سر ٹکرا دیا ۔

"ارے . . . خدا کے لئے بس بھی کرو . . . ادھر دیکھو، خاموش رہو . . . میں اب تمہیں کچھ نہیں کہوں گی . . ."

"نہیں . . . مجھے گالیاں دیجئے . . . مجھے جوتے سے ماریئے . . . میں اسی قابل ہوں . . . اگر میری وجہ سے آپ کی بدنامی ہوئی ہے . . . تو میں دریا میں چھلانگ لگا دوں گا . . . زہر پی لوں گا . . ."

"نہیں . . . ہرگز نہیں . . . پھر میرا کیا ہوگا ؟"

"کیوں ؟" چلّی ہکا بکا رہ گیا ۔

"بس کیا بتاؤں ۔" شاہدہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ۔

"پتہ نہیں وہ کیسی ساعت تھی . . . جب میرا سینڈل تمہاری ناک پر پڑا تھا . . . آہ . . . بس . . . اسی وقت سے مجھے بھی . . ."

اس نے کار روک دی اور دوپٹے کا آنچل انگلی میں لپیٹنے لگی ۔ تب چلّی کی سمجھ میں آیا کہ اس نے شرمانے کی کوشش کرنے کے لئے کار روکی ہے ۔

"مجھے بھی . . ." وہ اسی طرح انگلی پہ آنچل لپیٹتی ہوئی بولی ۔

"تم سے . . . مم . . ."

پھر اس نے جملہ پورا کئے بغیر اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔

تھوڑی دیر بعد کار ایک ایسی سڑک پر جا رہی تھی جس کے دونوں طرف شاہ بلوط کے اونچے اونچے درخت تھے اور چلّی سوچ رہا تھا کہ کاش اس کے پر دادا مداری شاہ کے بھی کچھ درخت ہوتے دفعتاً شاہدہ نے گانا شروع کر دیا۔

ع "بھول نہ جانا پیا سپنوں میں آنا پیا"

اور چلّی نے بھی تڑپ کر ٹکڑا لگایا۔

ع سپنوں کی رانی میری، تیرا کھلونا پیا

کار کے اوپر دو کبوتر اپنی چونچیں ملاتے ہوئے اڑ رہے تھے، اور قریب ہی ایک چرواہا ایک بھینس کی پیٹھ پر اکڑوں بیٹھا بنسری بجا رہا تھا۔ پھر کار ایک چشمے کے کنارے رک گئی۔ اور دونوں کار سے اتر کر پانی میں اپنی پرچھائیاں دیکھنے لگے۔

پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔

اچانک چلّی نے سوچا کہ لگے ہاتھوں عہد و پیماں بھی ہو جائیں تو بہتر ہے۔ کیونکہ چشمے کا کنارہ بھی ہے۔ موسم بھی سہانا ہے اور دو کبوتر ایک درخت پر بیٹھے ہوئے چونچیں بھی ملا رہے ہیں۔ بس چلّی نے کہا کہ خواہ سورج مشرق کی بجائے مغرب سے کیوں نہ طلوع ہونے لگے۔ مکئی کے کھیت میں کدو کیوں نہ اگنے لگیں، لیکن وہ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہونگے۔ شاہدہ نے فوراً ہی اسے ٹیک ہینڈ۔

واپسی پر دونوں نے ایک ڈوئٹ شروع کیا جس کے بول تھے۔

ع بچھڑے ہوئے ملے ہیں پھر
سب کا خدا بھلا کرے

چلّی کی آمد و رفت پھر کوٹھی میں شروع ہو چکی تھی۔

شطرنج کی بازیاں شباب پر تھیں اور اب شاہدہ بھی شطرنج میں بے حد دلچسپی لینے لگی تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سر فیاض کو اس کے اس رویّے پر بے حد حیرت ہو۔

ویسے وہ اس وقت بہت زیادہ خوش نظر آنے لگتے تھے، جب وہ بھی وہیں آ کر بیٹھ جاتی اور کھیل کے دوران میں دونوں کو مشورے دیا کرتی۔

بات دراصل یہ تھی کہ شاہدہ بے حد چڑچڑی اور غصّہ ور واقع ہوئی تھی، اس لئے اعزّہ و اقربا میں سے کسی نوجوان کی ہمت اب تک نہیں پڑی تھی کہ اس کے لئے امّیدواری کا خواہشمند ہوتا۔ وہ ویسے بھی کسی کے آگے گھاس نہیں ڈالتی تھی۔ اس لئے سر فیاض کا اس کے مستقبل کے لئے متشوش ہونا ضروری تھا۔ مگر جب انہوں نے محسوس کیا کہ وہ پرنس چلّی پرویز کے آگے گھاس ڈالنا کیا، کھلیانوں کے ڈھیر لگا رہی ہے، تو انہیں بیحد خوشی ہوئی۔

ادھر چلّی کو بھی ایسا لگا کہ وہ اسے فرزندی میں لے ہی لیں گے مگر بے چارہ اس بدقسمتی کو کیا کرتا جس نے یہاں بھی پیچھا نہیں چھوڑا۔

پتہ نہیں کیسے سر فیاض کو اس کے اصل حالات کا علم ہو گیا یعنی اس کا باپ اسے عاق اور محروم الوراثت کر چکا ہے اور اب سمجھوتے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی کیونکہ اس کے باپ کی جائیداد پر کچھ

سوتیلے قسم کے حقدار بھی دانت لگا کر بیٹھے تھے اور شاید یہ زہر انہیں کی ذات سے پھیلا تھا۔

سر نیاض نے شاہدہ کی موجودگی ہی میں اس کا تذکرہ چھیڑتے ہوئے کہا۔

"تم نے آخر اب تک مجھے کیوں تاریکی میں رکھا تھا؟"

"میں نے آپ سے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ میں دولت میں کھیلتا ہوں، یا میں نے کبھی اپنی امارت کے تذکرے چھیڑے تھے؟" چلّی نے بُرا مان کر کہا۔

"پھر بھی تمہیں اپنے حالات سے آگاہ کرنا چاہیئے تھا؟"

"کیوں کرتا؟"

"سنو صاحبزادے! مجھے نافرمان قسم کی اولادوں سے بڑی نفرت ہے۔ اس لئے آئندہ میں تمہیں اپنے قریب نہیں دیکھنا چاہتا۔"

"آپ نہیں دیکھیں گے،" چلّی نے غصیلے لہجے میں کہا اور اٹھ کر چلا آیا۔

وہ جانتا تھا کہ شاہدہ اس کے لئے ہوائی جہاز سے ہمالیہ کی سب سے اونچی چوٹی پر چھلانگ لگا سکتی ہے۔

وہ نہایت اطمینان سے رخصت ہوا۔

تب شاہدہ نے اپنی کالی ساری نکالی اور کالا بلاؤز نکالا اور انہیں پہن کر ایک درد بھری غزل گائی۔

؎ دنیا والوں کی باتوں میں پڑ کے سجنوا چھوڑ گئے
مجھ دکھیا کی بھی سُن لیتے ہائے تڑپتا چھوڑ گئے

غزل ختم کر کے اُس نے آنسو پونچھے اور مسہری پر لیٹتے ہی سو گئی

"مگر وہ کیا کہتی ہے چلّے" رئیس الحسن نے چلّی سے پوچھا۔

"وہ تو کہتی ہے کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گی، تمہارے لئے سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں۔ دو چار فاقے بھی کرنے پڑے تو پرواہ نہ کروں گی۔"

"ہاں تو ٹھیک ہے، تم اسے کسی طرح لے آؤ۔ میں نکاح پڑھوا دوں گا۔"

"او۔ ۔ ۔ او۔ ۔ ۔ چچا ہوش میں ہو یا نہیں، سر نیاض نے اسے اگر عدالت میں نابالغ ثابت کرا دیا تو کیا ہوگا؟"

"ابے بس،" چچا سر ہلا کر بولا۔

"سنو بیٹا! میرا نام رئیس الحسن ہے، میں کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہتا جو میرے لئے ناممکن ہو۔ وہ لاکھ برس بھی عدالت میں جاتے اُسے نابالغ نہیں کر سکے گا، کیونکہ ابھی حال ہی میں اس کے سنِ بلوغ کو پہنچنے کا فیصلہ عدالت ہی کر چکی ہے۔"

"وہ کیسے ؟"

شاہدہ سرفیاض کی پہلی بیوی کی لڑکی ہے، وہ بھی صاحب جائیداد تھی۔ لیکن مرتے وقت اپنی جائیداد شاہدہ کے نام منتقل کر کے اس کے انتظامات اپنے ایک بھائی کے سپرد کر گئی تھی۔ وصیت کے مطابق جائیداد پر شاہدہ کو کلی اختیارات بالغ ہو جانے پر ہی حاصل ہو سکتے تھے لہٰذا ابھی حال ہی میں سرفیاض نے وہ جائیداد شاہدہ کے ماموں کے قبضے سے نکالی ہے۔ اس کے لئے عدالتی کارروائی کرنی پڑی تھی۔"

"تب تو وہ مارا"

چلی چٹکی بجا کر اُچھل پڑا۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔

"مگر چچا یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ شاہدہ کے کالج تک یہ قصہ کیسے پہنچا تھا ؟"

رئیس الحسن مُسکرا کر بولا۔

"چچا جو چاہتا ہے' ہو جاتا ہے۔"

"تم نے۔ ۔ ۔ تو تم نے۔ ۔ ۔ مگر کیوں ؟"

"بہتیری ایسی باتیں ہیں' جو ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں' اس کا شمار بھی انہیں میں کر کے خاموش ہو جاؤ' کیا سمجھے ؟"

چلی خاموش ہو گیا۔ وہ اس سلسلے میں کچھ سوچنا ہی نہیں چاہتا تھا' اس کے سر پر تو عشق کا بھوت سوار تھا۔

دوسرے دن چلی ہوسٹل سے ایک چھوٹے سے بنگلے میں منتقل ہو گیا بنگلہ رئیس الحسن نے کرایہ پر مہیا کیا تھا۔ چلی نے وہیں سے شاہدہ کو فون کیا وہ چلی آئی۔ شادی پہلے سے ہی پکی ہو چکی تھی۔

لہٰذا آدھ گھنٹے کے اندر اندر نکاح ہو گیا۔

سرفیاض کو اطلاع ملی تو انہوں نے سر پیٹ لیا۔ اطلاع کسی نے فون پر دی تھی۔ وہ بتائے ہوئے پتے پر پولیس لے کر پہنچے، لیکن یہاں اس نکاح میں مدعوئین میں انسپکٹر جنرل آف پولیس بھی تھے۔ کچھ اور بڑے آفیسر بھی تھے اور چلی سوچ رہا تھا کہ کیا یہ معزز مہمان آسمان سے ٹپکے ہیں۔ مگر رئیس الحسن کا کہیں پتہ نہ تھا۔

بہرحال سرفیاض کو منہ کی کھانی پڑی۔

آفیسر نے سمجھایا کہ وہ معاملے کو طول نہ دیں تو بہتر ہے کیونکہ اس میں انہی کی بدنامی ہوگی۔ دُنیا کی کوئی عدالت اس شادی کو غیر قانونی قرار نہیں دے سکتی کیونکہ شاہدہ بالغ تھی اور یہ شادی اس کی مرضی سے ہوئی تھی۔

بات سرفیاض کی سمجھ میں آگئی اور وہ چپ چاپ ان دونوں کو گھر لے آئے۔ اُن آفیسروں سے استدعا کی تھی۔ یہ بات پھیلنے نہ پائے۔

دوسرے دن فیاض نے باقاعدہ طور پر اعلان کر کے شاہدہ کا ہاتھ چلی کے ہاتھ میں دے دیا۔

چلی دم بخود تھا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ رئیس الحسن نے یہ سب کیوں کر ڈالا۔ تیسرے دن رئیس الحسن نے اُسے فون پر مبارکباد دی اور چلی نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

"چچا! اب تو خُدا کے لئے بتا دو ورنہ میرے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی۔"

"خدمتِ خلق میرا نصب العین ہے۔" رئیس الحسن نے دوسری طرف سے کہا۔

"میں نے دیکھا کہ اب تمہاری زندگی برباد ہو جائے گی کیونکہ ایک مالدار باپ تمہیں عاق کر چکا ہے لہٰذا میں نے تمہارے لئے دوسرے مالدار باپ کا انتظام کر دیا۔ سر فیاض لاکھوں کے آدمی ہیں اور ان کے بعد ساری جائیداد شاہدہ ہی کی ہوگی کیونکہ دوسری بیوی سے بھی اُن کی کوئی اولاد نہیں ہے۔"

"مگر تمہیں اس کا کیا فائدہ ہوا۔"

"کچھ بھی نہیں۔ خدمتِ خلق کرنے والوں کو اپنے فائدے اور نقصان کی پرواہ کب ہوتی ہے اچھا دیکھو! چلتے آج شام کو فیریز ڈنگ نائٹ کلب میں ضرور ملو۔ سر فیاض ہی کی میز پر ملنا۔ وہ آج کل زیادہ تر وہیں غم غلط کرتے ہیں مگر تنہا ہوتے ہیں لہٰذا آج ان کے ساتھ ایک آدھ بازی شطرنج کی ضرور ہونی چاہیئے۔ دیکھو برخوردار تمہارا فرض ہے کہ ان کا ہر طرح خیال رکھو۔"

"آج میں نہ آسکوں گا۔ یہ جو شاہدہ ہے نا، وہ کہتی ہے کہ کسی وقت میری نظروں سے اوجھل نہ ہوا کرو۔ چچا۔ خدا کی قسم اُسے اب اور زیادہ عشق ہوگیا ہے مجھ سے۔"

"ٹھیک ہے بھتیجے! لیکن یہ میرا حکم ہے کہ آج مجھے وہاں سر فیاض کی میز پر موجود ملو ورنہ تم جانتے ہی ہو مجھے تمہیں فرہاد اور مجنوں ہی کی طرح جان دینی پڑے گی؟"

"آخر کیوں؟"

"بس یونہی! لیکن اسے بھی کان کھول کر سن لو کہ جب میں وہاں آؤں تو تم یہ نہ ظاہر ہونے دینا کہ مجھے پہلے سے جانتے ہو۔"

"او چچا کے بچے میں پاگل ہو جاؤں گا۔"

"نہیں بیٹے تم عیش کرو گے اور چچا تو زندگی بھر یونہی دھکے کھاتا رہے گا۔"

"اچھا خیر یہی بتا دو کہ تم نے اتنے بہت سارے آفیسر کہاں سے جمع کر لئے تھے؟"

"بھئی انہیں وزیر داخلہ کی طرف سے تمہاری شادی کے دعوت نامے ملے تھے۔"

"وہ کیسے؟" چلی اچھل پڑا۔

"چچا کی طاقت۔ وزیر داخلہ میرا بہت خیال کرتے ہیں کیونکہ انہیں محض میری کوششوں کی بنا پر الیکشن میں کامیابی نصیب ہوئی تھی۔ اگر میں ان کی مدد نہ کرتا تو اُن کے مقابلے میں جو آزاد اُمیدوار کھڑا ہوا تھا انہیں چاروں خانے چت کر دیتا۔"

"آخر تم ہو کیا بلا چچا۔"

"چچا، جگت چچا۔ میں ہر خورد و کلاں کا چچا ہوں۔"

رئیس الحسن نے دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا۔

چلی مجبور تھا کہ اُس کے حکم کی تعمیل کرتا، نہ کرتا تو شاید جہنم میں پہنچ جاتا۔ وہ شاہدہ سے کسی نہ کسی طرح پیچھا چھڑا کر فیریز ونگ پہنچ گیا۔

سر فیاض اپنی میز پر تنہا تھے، چلی کو دیکھ کر انہوں نے بُرا سا منہ بنایا۔

"کیوں! کیا بات ہے؟" انہوں نے پیشانی پر بل ڈال کر پوچھا۔

"اوہ۔ ڈیڈی! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میری طرف سے آپ کا دل کیسے صاف ہو؟"

"چلو۔ ٹھیک ہے — جاؤ۔ . . . مجھے اور زیادہ پریشان نہ کرو، اگر شاہدہ مجھے پہلے ہی بتا دیتی تو اس کی نوبت ہی نہ آنے پاتی۔"

چلّی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اُسے بائیں جانب کسی کے رکنے کا احساس ہوا۔ وہ چونک کر مُڑا، آنے والا چچا تھا اور اس کی آنکھوں میں ان دونوں کے لئے حقارت تھی۔

"کیوں؟ سرفیاض۔ . . . یہ کون ہے؟" اس نے آنکھوں سے چلّی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" سرفیاض کا لہجہ بھی غصیلا تھا۔

"ایک ایسا لڑکا" رئیس نے زہر خند کے ساتھ کہا جس کے باپ نے اُسے نالائقیوں کی بنا پر عاق کر دیا ہے، یہ کوڑی کوڑی کا محتاج ہے؟

"تم سے مطلب! دفع ہو جاؤ یہاں سے کمینے . . . کتے" سرفیاض ہاتھ ہلا کر چیخے۔

لوگ اِدھر اُدھر سے دوڑ پڑے، سرفیاض کھڑے ہوئے پاگلوں کی طرح چیخ رہے تھے۔

"ہٹاؤ اِسے یہاں سے لے جاؤ۔ . . . لے جاؤ"

رئیس الحسن ایک طویل قہقہے کے ساتھ دروازے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

سرفیاض کو چلّی نے زبردستی بٹھا دیا، وہ اب خاموش ہو گئے تھے لیکن ان کا جسم بُری طرح کانپ رہا تھا۔

چلّی نے اُن لوگوں سے ہٹ جانے کی درخواست کی جو سرفیاض کے

پہنچنے پر میز کے قریب اکٹھے ہو گئے تھے۔

"مجھے . . . گھر لے چلو . . ." سرفیاض مردہ سی آواز میں بولے۔ مجھ پر ہارٹ اٹیک ہونے والا ہے . . . ارے ہاں کیا تم اُس آدمی کو جانتے ہو؟"

"نہیں ڈیڈی! وہ کون تھا؟ جس نے آپ کو اس قدر پریشان کیا۔ اگر اب کہیں اس سے ملاقات ہوتی تو میں اُسے قتل ہی کر دوں گا۔"

سرفیاض کچھ نہیں بولے، چلّی نے بھی مزید استفسار نہیں کیا، وہ انہیں سہارا دے کر صدر دروازے کی طرف لے جا رہا تھا۔

دوسری شام چلّی نے پھر فون پر رئیس الحسن کی کال ریسیو کی اس نے اس کو اُسی بنگلے میں طلب کیا تھا، جہاں اس کا نکاح ہوا تھا۔ چلّی کو پچھلی رات نیند نہیں آئی تھی۔ وہ یہی سوچتا رہ گیا تھا کہ آخر فیریز ونگ والی حرکت کا کیا مطلب تھا، سرفیاض چچا کی باتوں پر پاگل کیوں ہو گئے تھے؟ اُس نے سوچا ممکن ہو رئیس الحسن نے اسی مسئلے پر روشنی ڈالنے کے لئے اُسے بلایا ہو۔

وہ شاہدہ کو جھانسہ دے کر کوٹھی سے نکل گیا۔

چچا اُس بنگلے میں تنہا نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ ایک قبول صورت عورت بھی تھی اور دونوں شراب پی رہے تھے۔

"آؤ — او — پیارے بھتیجے" وہ جھومتا ہوا بولا۔ "یہ حرّافہ تمہاری چچی بننا چاہتی ہے۔"

عورت آنکھیں میچ کر کھنکناتی ہوئی آواز میں ہنسی، لیکن کچھ بولی نہیں۔ چلّی اُسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔

دفعتاً عورت نے رئیس الحسن کے چہرے کے قریب انگلی نچایا۔

شعر پڑھا ؎

نیند اُس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کے شانوں پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں،

"ارے... بکواس بند کرو!... مجھے نفرت ہے... شعر و شاعری سے!"
چچا دانت پیس کر بولا، وہ بھی بہت زیادہ نشے میں معلوم ہوتا تھا۔
مگر عورت نے پھر وہی شعر دُہرایا اور چچا میز پر ہاتھ مار کر چیخا۔
"تھوڑی دیر خاموش رہو۔"
عورت نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ دبا لیا۔
یہ لوگ خواب گاہ میں تھے۔ چلّی کا دَم اُلٹنے لگا، شراب کی بُو اُس کا دماغ پھاڑے دے رہی تھی۔
"ہاں بیٹے چلّے" چچا جھومتا ہوا بولا "میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا بلکہ اپنے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ بجھائی ہے۔"
"کیا مطلب؟"
"یہ شاہدہ بچپن ہی میں مجھ سے منسوب ہوئی تھی۔"
"ارے... باپ رے۔" چلّی نے دونوں ہاتھوں سے کلیجہ دَبا لیا۔
"ابے مرا کیوں جاتا ہے۔" چچا اس کے شانے پر ہاتھ مار کر ہنسا "تجھ سے چھینوں گا نہیں۔"
عورت نے پھر وہی شعر پڑھا۔
"اوہ... میں تمہیں دفن کر دوں گا، ورنہ خاموش رہو۔"
عورت آنکھیں بھینچ کر ہنسی اور پھر خاموش ہو کر جھومنے لگی چچا نے چلّی سے کہا۔

"لیکن جب مجھے میرے باپ نے عاق کر دیا تو سر فیاض نے یہ نسبت بھی منسوخ کر دی۔ میں نے احتجاج کیا جس کا جواب یہ تھا کہ شاہدہ جیسی لڑکی کسی نالائق اور کوڑی کوڑی کے محتاج لڑکے کے لئے نہیں ہے... ہاہاہا... سر فیاض تم اُلّو کے پٹھے ہو... یہ دیکھو یہ لڑکا بھی نالائق ہے اور کوڑی کوڑی کا محتاج ہے... چلّے نا... جب تمہیں تمہارے باپ نے عاق کیا تھا... ہاہا... سر فیاض... ہاہا... لعنت ہے تم پر... اگر اب مجھے منہ دکھانے کے لئے زندہ رہو۔"
عورت نے پھر ہانک لگائی ؎

نیند اُس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کے شانے پر تری زلفیں پریشان ہوئیں،

"ارے تمہیں خُدا غارت کرے..."
چچا نے اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔
عورت ایک قہقہہ لگا کر خاموش ہوگئی۔
"مگر شاہدہ کو تم سے محبت تو نہیں تھی" چلّی نے کہا۔
"نہ رہی ہوگی" چچا لاپرواہی سے بولا۔
"مجھے بھی نہیں تھی، لیکن میری خواہش تھی کہ اس سے شادی ہو جاتی۔"
"اچھا بس اب یہ قصّہ ختم کرو" چلّی ہاتھ اٹھا کر بولا۔
"اب میرے لئے کیا حکم ہے، کوٹھی ہی میں رہوں، یا ہوسٹل چلا آؤں؟"
"اب ہوسٹل میں آ کر کیا کرو گے۔ مزے کرو۔ راوی عیش ہی عیش لکھتا ہے۔"

"اگر اب بھی کوئی داؤ پیچ باقی ہو تو خدا کے لئے مجھے ابھی سے بتا دو لیکن چچا۔ میں شاہدہ کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"آہاہاہاہا" چچا نے چھت شگاف قہقہہ لگا کر کہا۔

"ابے چلے۔ کیا میں تجھ سے چھین لوں گا اُسے' یہ خیال دل سے نکال دے . . . شاہدہ تیری ہے اور ہمیشہ تیری ہی رہے گی۔"

عورت شاید بور کرنے پر تلی بیٹھی تھی۔ اس نے پھر وہی شعر پڑھ دیا اور چچا اٹھتا ہوا چلی سے بولا۔

"ذرا پانچ منٹ کے لئے میرے ساتھ آؤ۔"

چلی اٹھ کر اس کے ساتھ باہر لان میں آیا۔ یہاں چچا نے ایک جانب جھاڑیوں میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑا سا رسّہ نکالا اور چلی کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے پھر عمارت میں گھس گیا۔ اب عورت باقاعدہ طور پر وہی شعر گنگنانے لگی تھی۔

دفعتاً چچا اس پر ٹوٹ پڑا اور اُسے بولنے کی بھی مہلت نہ دی۔ دوسرے ہی لمحے میں وہ کمرے کے فرش پر تھی اور چچا اُس کے ہاتھ پیر باندھ رہا تھا۔

عورت اس طرح ہنس رہی تھی جیسے اس کے ساتھ کوئی بہت دلچسپ قسم کا مذاق کیا جا رہا ہو۔

"یہ کیا کر رہے ہو چچا؟" چلی نے بوکھلا کر پوچھا۔

"میں اسے شعر کا مطلب سمجھاؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔"

"کس گدھے کو آج کل فکر کرنے کا ہوش ہے۔" چلی نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"اب اسے چھت سے لٹکانے میں میری مدد کرو . . . اے چلے منحوس

نہیں ورنہ میں تمہیں قتل کر کے یہیں دفن کر دوں گا۔" چچا کا لہجہ خوفناک تھا۔

عورت جو بہت زیادہ نشے میں تھی اب غافل ہو گئی تھی اس لئے اُسے چھت سے اُلٹی لٹکانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔

پھر چچا نے پلنگ اُس کے نیچے کھینچ لیا اور اُس پر اس طرح لیٹ گیا کہ اس کی لٹکتی ہوئی زلفیں اس کے شانوں پر بکھر گئیں۔

تب اُس نے پیروں سے سینے تک چادر کھینچتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں شعر پڑھا ؎

نیند اُس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
جس کے شانے پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

اور پھر چلی کو للکارا۔

"بھاگ چلے! حرام خور . . . زلفیں پریشاں ہو گئیں . . ."

چلی سر پر پیر رکھ کر وہاں سے بھاگا۔

کیونکہ چچا نے شعر نہیں اُلٹا تھا بلکہ شروع سے اب تک کے عشقیہ اور جنسی لٹریچر کو مرغا بنا دیا تھا۔

. . . . . .

•

شاہدہ بہت جلد بور ہوگئی تھی۔ دس پندرہ دن بعد ہی سے اُسے محسوس ہونے لگا تھا جیسے چلّی معمولی سے بھی کمتر ین قسم کا آدمی ہو۔ یعنی چھینکتا بھی تھا۔ اور چھینک آنے سے پہلے طرح طرح کے منہ بھی بناتا تھا اور چھینک کے اختتام پر کچھ اس طرح بوکھلا کر الحمدللہ کہتا تھا کہ اگر نہ کہا تو کوئی جھاپڑ رسید کر دے گا۔

ایک دن بے حد اُکتا کر شاہدہ نے پوچھا "یہ تم نے کالج جانا کیوں چھوڑ دیا ہے؟"

"اب کالج جا کر کیا کروں گا"

"کیوں! اب کیوں نہ جاؤ گے؟"

"شادی تو ہوگئی"

"اچھا تو پھر؟"

"اب پڑھ لکھ کر کیا کروں گا؟"

"دماغ تو نہیں چل گیا، کیسی باتیں کر رہے ہو؟"

"میں کیا جانوں، والدہ صاحبہ بچپن میں کہا کرتی تھیں ارے کم بخت پڑھ لکھ

نہیں تو شادی کیسے ہوگی۔ اب ہوگئی نا۔ لہٰذا اب پڑھنے لکھنے سے کیا فائدہ؟"

"اوّل درجے کے بیک وَرڈ لوگ معلوم ہوتے ہو" شاہدہ تیوری چڑھا کر بولی "خواہ مخواہ پرنس مشہور کر رکھا تھا اپنے آپ کو"

"کنوئیں کی مینڈک ہو تم" چلّی جھنجھلا کر بولا "میں نے تو ایسے ایسے پرنس دیکھے ہیں جو اپنا نام تک نہیں لکھ سکتے اور بگھارے بینگنوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہضم کر سکتے"

"فضول باتیں مت کرو۔ ڈیڈی کہہ رہے ہیں کہ اب تمہیں کالج جانا چاہئیے"

"ڈیڈی کو کیا پتہ کہ وہاں نامحرم لڑکیاں مجھے کس طرح گھورا کرتی ہیں" چلّی نے شرما کر کہا اور شاہدہ اسے حیرت سے دیکھنے لگی۔

"تو پھر تم نے وہاں داخلہ کیوں لیا تھا؟" اُس نے بالآخر پوچھا۔

"میں کیا کرتا ابا حضور جان کو آگئے تھے۔ کہنے لگے سائیکولوجی تجھے ضرور پڑھنی پڑے گی چاہے ہم جماعت چڑیلیں ہی کیوں نہ ہوں اور کم بخت منشی نے کہا تھا کہ کنورجی لڑکیاں زبردستی آپ کی گود میں تھوڑا بیٹھ جائیں گی"

"منشی نے ٹھیک ہی کہا تھا" شاہدہ نے غصیلی آواز میں کہا۔

"باتیں تو اب تم بھی یہی کہو گی" چلّی کراہا۔

"اپنی نظریں نیچی رکھا کرو"

"یہ بھی کر کے دیکھ چکا ہوں۔ ہُش ہُش اور شوشو کرتی ہیں"

"کچھ بھی ہو تمہیں کالج جانا پڑے گا۔"

"اور دوسری بات بھی ہے"

"وہ کیا ہے؟" شاہدہ آنکھیں نکال کر بولی۔

"تمہاری جدائی پل بھر کے لئے بھی گوارا نہیں"

"سڑی بُسی باتیں مت کرو۔ کس رومانی ناول سے رٹا تھا یہ جملہ "

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا "

"کیا نہیں سوچ سکتے تھے ؟"

"کہ تم اتنی کٹھور ہو جاؤ گی "

"تمہیں کالج جانا پڑے گا "

چلّی بسور کر رہ گیا۔

بات دراصل یہ تھی کہ اُن دنوں شاہدہ کی کوٹھی میں شاہدہ کی کزنس کی بھرمار رہتی تھی۔ ایک سے ایک طرحدار اور رنگدار۔ چہچہوں اور قہقہوں کے درمیان چلّی تختۂ مشق بنا رہتا تھا۔ ہو سکتا ہے یہی ادا شاہدہ کو نہ بھائی ہو۔ بہر حال اسے دوسرے دن کالج جانا پڑا تھا۔ چچا سے مڈبھیڑ ہوئی لیکن اُس نے اُس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تک نہیں۔

"ایسی بھی کیا بے مروّتی چچا . . . " چلّی نے حیرت سے کہا تھا لیکن وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔

چلّی اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ دوسروں نے البتہ چلّی کو گھیر لیا تھا۔

"کہو بیٹے کیسی گزر رہی ہے ؟" کسی نے سوال کیا۔

"اللہ کا شکر ہے "

"بہت گہرا نکلا " دوسرا بولا۔

"کوئی چکر ہو گیا ہو گا " تیسرے نے بائیں آنکھ دبا کر کہا "کیوں استاد . . . "

"کیا مطلب ؟" چلّی نے آنکھیں نکالیں۔

"یہی کہ ایسی چٹ پٹ شادی ہوتے نہیں دیکھی۔ کتنے دن چلا تھا رومانس ؟"

"خدا سے ڈرو۔ میں کوئی بدمعاش ہوں" چلّی کھسیانی ہنسی کے ساتھ بولا۔

"نہیں تم تو اللہ میاں کی گائے ہو۔ بدمعاشی اسی نے کی ہو گی "

"اے خبردار تمیز سے . . . " چلّی کو یک بیک غصہ آ گیا۔

وہ سب قہقہے لگاتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔ پھر کلاسیز میں بعض استادوں نے بھی اس پر فقرے چُست کئے تھے۔ لڑکیاں اُسے دیکھ کر ہنسی تھیں۔

اور پھر وہ شادی تو ایسی ہوئی تھی کہ پورے شہر کو خبر ہو گئی تھی بھلا کالج میں اس کی شہرت کیوں نہ ہوتی۔ جدھر سے بھی گزرتا انگلیاں اٹھنے لگتیں۔

ایسا بور ہوا کہ دوسرے دن کالج جانے کی بجائے شاہدہ کی ایک کزن کے گھر جا پہنچا، وہی جو اُسے بہت زیادہ چھیڑتی تھی۔ ناہید نام تھا۔ بڑی چلبلی اور آزاد خیال لڑکی تھی۔ خوش شکل بھی تھی، ہنستی تھی تو گالوں میں گڑھے پڑتے تھے اور چلّی کے دلِ ناصبور میں گدگدیاں سی ہونے لگتی تھیں۔

"ہلو شہزادے !" وہ اسے دیکھ کر چہکی "چیل کے پنجے سے کیسے رہا ہوتے ؟"

"چچ چیل ـــ" چلّی ہکلایا۔

"ارے . . . تمہیں حیرت ہوئی۔ کیا تم نہیں جانتے کہ نوجوان اعزّہ میں وہ چیل کہلاتی ہے "

"مجھے نہیں معلوم تھا "

"مجھے اس پر حیرت ہے کہ تم پر وہ کیسے جھپٹا مار سکی"

"میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رہا"

"وہ اتنی چڑچڑی اور بد دماغ ہے کہ کوئی لڑکا اس کی طرف رُخ ہی نہیں کرتا تھا"

"نہیں چڑچڑی تو نہیں ہے"

"تو پھر یک بیک اُس کا دماغ خراب ہو گیا ہوگا"

"یقین کرو کہ تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی"

"واقعی تم بہت بھولے ہو"

نہ جانے کیوں چلّی کا دل بھر آیا تھا اِس جُملے پر۔ آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور ناہید تڑپ کر بولی "نہیں نہیں خُدا کے لئے رو نہ دینا، میں مردوں کے آنسو برداشت نہیں کر سکتی۔ تمہارا دِل دکھا ہو تو معاف کر دو"

اس نے آگے بڑھ کر چلّی کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اُس نے سچ مچ دونوں ہاتھوں سے منہ چھُپایا اور ہچک ہچک کر رونے لگا۔ ناہید بوکھلا گئی۔

"ارے . . . ارے . . . یوں بھی کیا . . . بھئی معاف کر دو۔ اب جو کبھی کچھ کہا ہو! ارے . . . ارے۔"

اتفاق سے آس پاس کوئی تیسرا موجود نہیں تھا۔ اس لئے بات آگے نہ بڑھ سکی اور چلّی نے بھی خود پر قابو پانے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ اس کی تو سمجھ میں ہی نہ آ سکا کہ اچانک اِس طرح رو کیوں پڑا تھا۔

اس کے پُرسکون ہو جانے پر ناہید بولی تھی "مجھے تمہارے دُکھ کا پورا پورا احساس ہے"

چلّی سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خود کیا بولے۔

"ٹھہرو، میں تمہارے لئے مالٹوں کا رس لاتی ہوں" ناہید نے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

اِدھر چلّی کا دل چاہ رہا تھا کہ جوتے اتارے اور اپنا سر پیٹ ڈالے آخر رو دیا کیوں تھا۔ اب یہ بات بھی پھیلے گی۔ شاہدہ تک پہنچی تو کیا ہوگا؟ کیا بتائے گا اُسے کہ کیوں رویا تھا اس کی پری چہرہ کزن کے سامنے۔ تھوڑی دیر بعد وہ مالٹوں کے رس کا گلاس لئے ہوئے واپس آ گئی۔

پندرہ بیس منٹ سوچتے رہنے کے بعد چلّی نے کہا تھا "خدا کے لئے اس کا ذکر کسی سے بھی نہ کرنا"

"اچھا . . . اچھا . . ."

"میں بہت دُکھی آدمی ہوں"

"میرا بھی یہی خیال تھا" ناہید مغموم لہجے میں بولی۔

"تمہارا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گا کہ تم نے کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا"

"ارے ایسی بھی کیا بات ہے لیکن اگر تم چاہو تو مجھ سے اپنا دکھ درد بیان کر سکتے ہو۔ مجھے اپنا ہی ہمدرد سمجھو، کیونکہ یہاں اس شہر میں تمہارا اپنا کوئی نہیں ہے"

چلّی نے مغموم آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر سر جُھکا لیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر شاہدہ کی بجائے اسی ہمدرد لڑکی سے شادی ہو جاتی تو کیا حرج تھا۔

لیکن اُس کی سمجھ میں نہ آ سکا کہ اپنا کون سا دکھ بیان کر کے اس کی

مزید ہمدردیاں حاصل کرلے۔

"میں کہتی ہوں دل کا بوجھ ہلکا کرلو۔" ناہید بولی "اپنا دکھ مجھ سے بیان کردو۔ بڑی تسکین محسوس کروگے۔"

"بس کیا بتاؤں۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ کچھ سوجھ ہی نہیں رہی تھی۔ آخر لوکھلا کر بولا۔ "پہلے میرے داڑھی بھی ہوا کرتی تھی۔"

"اچھا؟" ناہید اس طرح اچھل پڑی جیسے داڑھی کے بجائے "دُم" ہونے کی اطلاع ملی ہو۔

"ہاں! داڑھی تھی۔ جب پہلے پہل یہاں پہنچا تھا۔ لیکن کالج میں لڑکوں نے اس طرح پریشان کیا کہ صاف کرادینی پڑی۔"

"یہ تو بہت اچھا کیا تھا تم نے۔ اگر داڑھی کے زمانے کی کوئی تصویر ہو تمہارے پاس تو مجھے ضرور دکھانا۔"

"نہیں تصویر تو نہیں ہے۔"

"خیر ہاں! تو پھر کیا ہوا؟"

"میرا باپ بہت ظالم ہے۔"

"میں نہیں سمجھی؟"

"جب میرے باپ کو داڑھی ضائع ہونے کی اطلاع ملی تو بہت برہم ہوا اور لکھ بھیجا کہ دوبارہ داڑھی کی داغ بیل ڈالی جائے ورنہ وہ میری شکل تک دیکھنے کا روادار نہ ہوگا۔"

"ظاہر ہے کہ تم اس بات سے متفق نہ ہوتے ہوگے؟"

"یہی بات تھی۔"

"اچھا تو پھر کیا ہوا؟"

"اُس نے مجھے عاق کردیا۔"

"نہیں۔" اُس نے منہ پر ہاتھ رکھ کر آنکھیں پھاڑ دیں۔

"یہی ہوا تھا کزن ناہید۔" چلی کا لہجہ بے حد دردناک ہوگیا۔

"اب میں سمجھی۔" وہ معنی خیز انداز میں سر ہلا کر بولی اور چلی اس کی شکل دیکھتا رہا۔

"اب میں سمجھی۔" ناہید پھر بولی۔ "انکل نے تمہیں لاوارث سمجھ کر چیل کے گھونسلے میں پھینک دیا۔ یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ تم واقعی مظلوم ہو۔ مجھے پوری طرح اپنی طرفدار سمجھو۔ میں انقلابی خیالات رکھتی ہوں۔ خود غرض بوڑھوں سے انتقام لیا جائے گا۔"

چلی اس کے لہجے سے دہل کر رہ گیا۔

"ان... تت... تقام...." وہ ہکلایا۔

"بس تم دیکھنا... بالکل پرواہ مت کرو۔"

چلی نے سعادت مندانہ انداز میں سر کو جنبش دی تھی۔

. . . . . .

اُسی شہر میں چلی کی ایک دُور پرے کی پھوپھی بھی رہتی تھی۔ اُسے اطلاع ملی کہ چلی اچانک ایک بڑے گھر کا داماد بن گیا ہے تو اُس نے افواہوں کی بنیاد پر کچھ کوائف ترتیب دیئے اور اس کے باپ کو لکھ بھیجے ۔۔۔ بس پھر کیا تھا۔ ایک گرماگرم خط سر فیاض کے پاس آپہنچا۔

شیخ چلی سینئر نے لکھا تھا۔

جنابِ والا!

بعد آداب کے واضح ہو کہ یہاں پر سب خیریت ہے اور آپ کی خیر و عافیت خداوند کریم سے نیک مطلوب نہیں' اب مجھے معلوم ہوا کہ میرے برخوردار کے ساتھ کیا چکر چلایا گیا ہے۔ پہلے داڑھی مونچھ منڈوا کر کرسٹان بنایا پھر اپنی میموں جیسی پر کٹی لونڈیا اس کے سر دے ماری۔ واہ۔ ۔ ۔ واہ کیا کہنا۔ ۔ ۔ اللہ نے چاہا تو بروزِ حشر نبی کی شفاعت نصیب نہ ہو گی' جیسا تم نے میرا دل جلایا ہے' اسی طرح جہنم میں جلو

گے۔ ۔ ۔ بس اب مجھے کچھ نہیں کہنا۔ ۔ ۔"

خُدا حافظ

سر فیاض نے خط پڑھا تو ایک بار پھر ان پر دل کا دورہ پڑ گیا۔ خاندان کے دوسرے افراد اِس خط کو اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے تھے۔ جیسے وہ چینی زبان میں لکھا گیا ہو۔

چلی اس وقت موقع واردات پر موجود نہیں تھا اسے تو اُردو ہی بھلا دینی پڑتی۔

شام کو مگن مگن جب کوٹھی میں داخل ہوا تو ایک ایک فرد اُسے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے گیدڑ کچھ سمجھے بوجھے بغیر شہر کی طرف آنکلا ہو۔ سیدھا اس کمرے کی طرف چلا گیا جہاں اس کا قیام تھا۔

شاہدہ اسے دیکھتے ہی بھوکی شیرنی کی طرح جھپٹ پڑی۔

"تم آخر ہو کون؟"

"تمہارا چلی پرویز" ۔۔۔ چلی نے لجاجت سے دانت نکال دیئے۔

"میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ سچ سچ کس نسل سے تعلق رکھتے ہو؟"

"کتنی بار بتاؤں کہ نادر شاہ دُرّانی ۔ ۔ ۔"

"ہرگز نہیں ۔ ۔ ۔ سات پشتوں سے تمہارے یہاں روئی دُھنکی جارہی ہے یا ترکاریوں کا کاروبار ہو رہا ہے"

"میں نہیں سمجھا؟" چلی سناٹے میں آگیا۔

"یہ دیکھو! کیا میں غلط کہہ رہی ہوں" اس نے چلی کے والد ماجد کا خط اس کے سامنے پھینکتے ہوئے کہا۔

چلی نے خط دیکھا تھا اور سر کھجانے لگا تھا۔

"یہ کسی شریف آدمی کا خط ہے یا کسی کن ملئے کا۔ ۔ ۔"

"بس بس بہت ہو چکا۔" چلّی کو بھی غصہ آگیا۔

"کیا ہو چکا۔ ۔ ۔ ابھی کچھ بھی نہیں ہوا۔ ۔ ۔ اب ہوگا۔"

"وہ تو ہوگا ہی؟" چلّی کو ہنسی آگئی۔ ۔ ۔

"ڈھیٹ۔ ۔ ۔ بے شرم۔ ۔ ۔ بے غیرت۔ ۔ ۔"

"ارے زبان سنبھال کے۔ ۔ ۔ کیسی بے شرمی۔ ۔ ۔ سبھی کے ہوتا ہے۔"

"کیا ہوتا ہے؟"

"میں کیا جانوں۔" چلّی نے شرما کر انگلی دانتوں میں دبائی۔ ۔ ۔ ۔

"تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔"

"میرا دماغ بالکل ٹھیک ہے۔" چلّی نے سخت لہجے میں کہا۔ "اگر تم خاندانی منصوبہ بندی والوں کے پاس گئیں تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

"خدا غارت کرے تمہیں میں کیا کہہ رہی ہوں اور تم کیا سمجھ رہے ہو۔" وہ دانت پیس کر بولی۔

"چلو غصہ تھوک دو۔ ۔ ۔ کھٹائی یا آچور وغیرہ کو دل چاہے تو بتا دینا۔"

وہ شاید اس پر حملہ کرنے کے لئے جھپٹی تھی اور چلّی بوکھلا کر پیچھے ہٹ گیا تھا۔

اسی وقت اس کی ایک کزن بھی کمرے میں گھس آئی اور چلّی زور زور سے ہنسنے لگا۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے۔ شور مت مچاؤ۔ ۔ ۔ انکل کی ابھی آنکھ لگی

ہے؟"۔ ۔ ۔ اس نے دونوں کو گھورتے ہوئے کہا۔

"تم بغیر اجازت کمرے میں کیوں داخل ہوئیں۔" شاہدہ اس پر اُلٹ پڑی۔

"آگئی ہوں گی غصہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" چلّی جلدی سے بولا۔ "میں نے تو بُرا نہیں مانا۔"

"اوہ۔ ۔ ۔ تم۔ ۔ ۔ دور ہو جاؤ میری نظروں سے۔" وہ مُٹھیاں بھینچ کر چیخی۔

"جا رہا ہوں۔ چلا جاؤں گا۔ لیکن دوسروں سے تو بد اخلاقی سے نہ پیش آؤ۔"

اس طرح چلّی پھر نکل بھاگا۔ باپ نے جو خط لکھا تھا۔ اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی اس کی نظروں میں۔ یہ تو بے حد شریفانہ خط تھا۔ ورنہ اس نے تو انہیں خطوط میں گالیاں لکھواتے بھی سنا تھا اور بے چارے منشی جی بعض گالیوں کے ہجّے خود چلّی سے پوچھا کرتے تھے۔

"جنابِ والا" جیسے طرزِ تخاطب کی امید باپ سے نہیں رکھتا تھا اسے تو خوشی ہو رہی تھی کہ اس کی عدم موجودگی میں خاصے مہذب ہو گئے ہیں۔

گھنٹے دو گھنٹے گزار کر رات کے کھانے کے وقت پھر کوٹھی میں جا دھمکا تھا۔

کسی نے کھانے کو بھی نہ پوچھا۔ شاہدہ کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ آخر اس نے باورچی خانے کی راہ لی۔

خانساماں نے بھی اسے دیکھ کر منہ بنایا تھا لیکن وہ سودے کی میز کے قریب کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا۔ انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ اس خط کی اطلاع

کوٹھی کے ہر فرد کو ہوگئی ہے۔

ایک بڑی بی جو خاندان کی پروردہ تھیں۔ باورچی خانے میں داخل ہوئیں اور بڑی تشویش سے چلی کا جائزہ لینے لگیں۔ چلی سر جھکائے بیٹھا تھا آخر بڑی بی نے کہا۔

"میاں یہ آخر آپ کے والد کو کیا سوجھی تھی؟"

"دراصل میں نے انہیں شادی کا دعوت نامہ نہیں بھیجا تھا اُسی کا ملال ہوگا۔"

"دعوت نامہ نہیں بھیجا تھا" بڑی بی نے حیرت سے دُہرایا۔

"میں جلدی میں بھول گیا تھا"

"بڑی حیرت ہے بیٹے کی شادی ہو جائے اور باپ کو خبر تک نہ ہو"

"پُرانی روایت ہے ہمارے خاندان کی۔ ۔ ۔"

"میں نہیں سمجھی میاں ۔ ۔ ۔"

"نادر شاہ دُرّانی نے بھی اسی طرح شادی کر لی تھی۔ ۔ ۔ اپنے باپ کو بتائے بغیر۔ ۔ ۔ باپ نے اس کے خلاف جو آواز اٹھائی تھی، اس کی رسم ابھی تک چلی آرہی ہے لڑکے کا باپ سمدھی کو ایک ایسا خط ضرور لکھتا ہے"

"مگر صاحب پر تو دورہ پڑ گیا"

"انہیں ہماری خاندانی روایات کا علم نہیں ہے"

"تو پہلے سے آگاہ کر دینا تھا میاں ۔ ۔ ۔"

"بس بھول گیا تھا۔ خانساماں کھانا لگاؤ۔ یہیں کھائیں گے"

"تو میاں۔ اب یہ بات صاحب کو کیسے سمجھائی جائے، ان کی حالت تو بہت خراب ہوگئی ہے اور خط میں تو لکھا ہے کہ انہوں نے آپ کو عاق کر دیا ہے"

"نادر شاہ دُرانی کے باپ نے بھی انہیں وقتی طور پر عاق کر دیا تھا لیکن وہ جھلا کر ہندوستان پر حملہ کر بیٹھے تھے اور باپ کو لکھ بھیجا تھا کہ میں نے آپ کو بات سے طاق کیا"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن صاحب کو کیسے سمجھایا جائے"

"فکر کیوں کرتی ہو ۔ ۔ ۔ سب ٹھیک ہو جائے گا"

"میاں تم جانو میں تو سب کی خیر خواہ ہوں"

خانساماں نے الٹا سیدھا کھانا میز پر لگا دیا تھا اور چلی زہر مار کرنے لگا تھا۔

اتنے میں خانساماں کو بھی مزید پوچھ گچھ کی سوجھ گئی۔

"تو صاحب یہ نادر شاہ دُرانی صاحب آپ کے کون تھے؟"

"مجھے یاد نہیں۔ لمبا سلسلہ ہے۔ میرے باپ نے نوٹ کر رکھا ہو گا" چلی نے جواب دے دیا۔

"آخر ہندوستان پر حملے کی کیا ضرورت تھی۔ ناراضگی باپ سے تھی۔ ہندوستان نے ان کا کیا بگاڑا تھا؟"

"تم کیا جانو شاہانِ سلف اپنا گھریلو غصہ ہندوستان ہی پر اتارا کرتے تھے"

"شاید بی بی کو پورے ایک ماہ بعد غصہ آیا ہے"

"عورتوں کی رال نہیں گلتی وہ کسی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں"

"خدا کے لئے دُور ہی رہیئے گا ان سے . . . ." خانساماں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔" اور ساری وزنی چیزیں کمرے سے ہٹا دیجئے گا۔"

"کیوں"

"وزنی چیزوں سے کہیں کی ہڈی بھی ٹوٹ سکتی ہے، غصے میں جو چیز بھی ہاتھ آجائے کھینچ مارتی ہیں۔"

"ارے نہیں ایسا بھی کیا . . . ."

"آگاہ کر دیا ہے میں نے . . . میرا فرض تھا . . ."

"خیر . . . خیر . . . مچھلی کا ایک پیس اور دینا۔"

کھانے سے فارغ ہو کر باورچی خانے سے نکلا تھا اور سر نیاض کی طرف جانے کی کوشش تھی، لیکن اسے روک دیا گیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔" وہ زچ ہو کر بولا کسی کے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔

آخر جھنجھلا کر کوٹھی سے نکل کھڑا ہوا اور کالج کے ہوسٹل کی راہ لی۔

چچا ہوسٹل میں موجود تھا۔ سیدھا اسی کمرے میں جا پہنچا جہاں اس کی موجودگی کی اطلاع ملی تھی۔

چچا نے اسے دیکھ کر بُرا سا منہ بنایا اور بولا" اب، چچا چھوڑ میرا پیچھا . . . تیرا کام تو بن گیا نا . . ."

"دوسری مصیبت چچا . . ."

"اب کیا ہوا . . ." چچا نے پوچھا اور چلی کی کہانی کی تازہ قسط سن کر بے ساختہ ہنس پڑا . . . پھر بولا" یہ سر نیاض فوج میں انڈے سپلائی کرتا

تھا اور چھوٹے خاں کہلاتا تھا۔ یہی اصل نام بھی تھا اس کا بھی ایک لطیفہ ہے سن کر یاد کر لے تو شاید کبھی کام آجائے . . . "

"ضرور . . . ضرور" چلی چہک کر بولا۔

"شاہدہ کے دادا اور فوج کے کرنل کے خانساماں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ ایک دن کرنل صاحب کے باورچی خانے میں براجمان تھے کہ کرنل بہادر دہاڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس کے داہنے ہاتھ کی انگلیاں زخمی تھیں، اور وہ شیو کرنے میں دشواری محسوس کر رہا تھا۔ خانساماں سے کہا کہ وہ شیو کر دے لیکن شاہدہ کے دادا چھوٹے خاں صاحب اپنی خدمات پیش کر بیٹھے۔ شیو کیا کرنل کا . . . . اور کرنل نے کہا تم تو کمال کے آدمی ہو . . . . . . اب تم ہی آکر روزانہ شیو کر دیا کرو۔ میں تمہیں خان [illegible] دوں گا . . ."

"کیا واقعی۔" چلی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ہاں ہاں . . . پہلے وہ مرغی والا . . . خان صاحب بنا تھا پھر خان بہادر اور صاحبزادے سر کا خطاب لے بیٹھے تھے۔ بہرحال حجامت ہی کے صلے میں چھوٹے خاں کو خان صاحبی نصیب ہوئی تھی۔"

"اب دیکھوں گا صاحبزادی کو . . . مجھے نداف اور ترکاری فروش کی اولاد کہہ رہی تھی۔"

"ضرور، ضرور . . . جی بھر کے ذلیل کرنا . . . مرغی والے کی اولاد کو . . ."

. . . . . .

•

دوسرے دن چلی نے پھر کوٹھی کا رُخ کیا تھا . . . شاہدہ لان میں ٹہلتی ہوئی ملی . . . اسے دیکھ کر رُک گئی تھی اور اس طرح گھور نے لگی تھی جیسے کچا چبا جائے گی۔

"رات کہاں تھے ؟"

"ہوسٹل میں ؟"

"کیوں ؟"

"تم نے تو بیڈ روم کا دروازہ بند کر لیا تھا۔"

"اتنی بڑی کوٹھی میں کہیں اور مر رہنے کو جگہ نہیں ملی تھی ۔"

"تم بہت آگے بڑھتی جا رہی ہو زبان کو لگام دو ۔"

"کیا مطلب ؟"

"کیا شوہروں سے اسی طرح گفتگو کی جاتی ہے ؟"

"شوہر ۔۔۔ ہونہہ . . . فراڈ . . . شہزادے صاحب ۔۔"

"بس بس آگے نہ بڑھنا . . . میں بھی سب جانتا ہوں . . ."

"کیا جانتے ہو ۔"

"بہتری اسی میں ہے کہ میری زبان نہ کھلواؤ ۔"

"میں کہتی ہوں کہ تم رات کو گھر سے باہر کیوں رہے ؟"

"تمہیں کیوں فکر ہے . . . تم تو کمرہ بند کر کے بیٹھ رہی تھیں ۔"

"تم . . ." وہ صرف گھور کر رہ گئی۔

"ہاں کہو کہو چپ کیوں ہو گئیں ۔"

"تم اب میرے قریب بھی نہیں آ سکتے ۔"

"آخر کیوں . . ."

"پتہ نہیں کیا چیز ہو . . . اور تمہاری اصلیت کیا ہے . . . ہم لوگوں نے تو سچ مچ شہزادہ سمجھ لیا تھا ۔"

"چلو نہیں ہوں شہزادہ لیکن کسی مرغی والے کی اولاد بھی نہیں ہوں . . ."

"کیا مطلب ؟"

"یہ چھوٹے موٹے خاں . . . جنڈی کے نام تو نہیں ہوتے ۔"

"کیا کہنا چاہتے ہو ؟"

"اور نہ جنڈی انڈے مرغی سپلائی کرتی پھرتی ہے ۔"

"میں سمجھ گئی . . . مجھے پتا ہے کہ تم آج کل ناہید کے گھر میں گھسے رہتے ہو ۔"

"تمہاری کزن ہے۔ کوئی گری پڑی لڑکی تو نہیں ہے ۔"

"میں کہتی ہوں اگر تم اُدھر گئے تو اچھا نہ ہوگا ۔"

"واہ یہ بھی خوب رہی نہ اپنے قریب آنے دیں گی اور نہ کہیں اور جانے دیں گی ۔"

"تم فضول بکواس نہ کرو مجھ سے۔"

"میں ضرور کروں گا کیونکہ تم بھی بکواس کرنے میں مجھ سے پیچھے نہیں ہو۔"

"تمہیں تو عورتوں سے بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے۔"

"عورتوں سے بات چیت کا قائل ہی نہیں ہوں۔ اگر ڈھنگ کی ہو تو خاموشی سے پوجا کرتا رہتا ہوں . . ."

"بڑی آرٹسٹک باتیں کر رہے ہو۔" شاہدہ نے جلے بھنے انداز میں کہا۔

"کیا ناہید کا ماڈل بننے کا ارادہ ہے۔"

"اچھا تو کیا وہ آرٹسٹ بھی ہے . . ."

"کیڑے مکوڑے بنایا کرتی ہے . . . اور دو چار میں بیٹھ کر ایسا پوز کرتی ہے جیسے مانی و بہزاد کی بھتیجی ہو۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا۔ اب اس کا ورک ضرور دیکھوں گا۔"

"قدم اٹھا کر تو دیکھو اس کی طرف۔" شاہدہ نے دھمکی دی۔

"واہ . . . یہ اچھی زبردستی ہے۔ خود اس قابل نہیں سمجھیں گی اور دوسروں کی طرف بھی نہیں جانے دیں گی۔"

"چلّی پرویز۔ وہی ہوگا جو میں کہوں گی۔"

"میں اس سلسلے میں ڈیڈی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہرگز نہیں . . . وہ کہہ چکے ہیں کہ اب تمہاری شکل نہیں دیکھیں گے۔"

"کمال ہے . . . وہ شکل نہیں دیکھیں گے۔ تم خوابگاہ کا دروازہ بند کر کے بیٹھ رہو گی . . . پھر کیا مصرف ہے اس گھر میں . . .؟"

"میں جانتی ہوں۔"

"اچھی بات ہے لاؤ میرے باپ کا خط مجھے دے دو۔"

"ہرگز نہیں۔"

"تم لوگوں کو پسند نہیں آیا تو پاس رکھ کر کیا کرو گے؟"

"تم اس کا کیا کرو گے؟"

"دوسروں کو دکھا کر انصاف طلب کروں گا۔"

"تم . . . تم . . . وہ خط دکھاؤ گے۔"

"بالکل . . . اور ان سے پوچھوں گا کہ آخر اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے۔"

"تمہارے باپ نے جو کچھ مجھے لکھا ہے۔ تم دوسروں کو دکھاؤ گے۔"

"اچھا تو تم ہی مشورہ دو کہ اس سلسلے میں کیا کروں۔"

"میں کچھ نہیں جانتی . . . میرا دماغ مت چاٹو ورنہ پھر مجھے غصہ آجائے گا۔"

"آجائے . . ." چلّی نے لاپروائی سے کہا تھا۔ شاہدہ تیزی سے مڑی تھی اور اندر چلی گئی تھی۔

چلّی کھڑا سوچتا رہا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئیے۔ چھوٹے خاں والا قصہ درست معلوم ہوتا تھا ورنہ وہ ناہید کا حوالہ کیوں دیتی اور خود بھی ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ واہ کیا نسخہ ہاتھ آیا ہے۔ چچا پھر چچا ہے . . .!

ناہید کا خیال آتے ہی اس نے ٹھنڈی سانس لی اور سوچنے لگا کہ شاہدہ سے محبت کرنے کے سلسلے میں اس سے جلد بازی سرزد ہوئی تھی۔ مگر پھر خیال آیا کہ وہ تو کرنی ہی پڑتی کیونکہ چچا یہی چاہتا تھا۔ اچھی

بات تو پھر ایک اپنی پسند کی بھی سہی۔ لیکن ناہید کے ساتھ وہ اس حد تک جا سکے گا اور کیا ناہید اسے اس نکتہ نظر سے بھی . . . ؟ حالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ پورچ میں بڑی بی کھڑی اشارے سے بلا رہی تھیں۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا ان کی طرف بڑھا۔

"میاں . . . اپنا سمجھ کر کہہ رہی ہوں۔" وہ ان کے قریب پہنچا تو آہستہ سے بولیں۔

"ہاں ہاں کہو . . . میں بھی تمہیں اپنی بزرگ سمجھتا ہوں۔"

"اللہ جیتا رکھے — میں یہ کہہ رہی تھی کہ کچھ دنوں کے لئے کہیں اور چلے جاؤ۔"

"آخر کیوں؟"

"گھر جہنم بنا ہوا ہے۔"

"میرا اس میں کیا قصور ہے؟"

"ہو یا نہ ہو! میرا مشورہ یہی ہے . . ."

"بڑی مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔"

"اللہ مددگار ہے۔ بس فی الحال دو چار دنوں کے لئے . . ."

"اِدھر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں اور اُدھر شاہدہ فون پر ناہید کے نمبر ڈائل کر رہی تھی۔

"ذرا بتانا تو . . . تمہارے باوا پارٹیشن سے پہلے کیا کرتے تھے۔"

"دماغ تو نہیں چل گیا۔" ناہید کی آواز آئی۔

"تم میرے شوہر کے کان بھرتی رہتی ہو . . ."

"میں بھرتی ہوں یا نہیں لیکن میرے باوا کا کیا ذکر۔"

"تم نے چلّی سے دادا جان کے بزنس کی بات کیوں کی تھی تمہیں کیا حق حاصل تھا؟"

"گھاس تو نہیں کھا گئیں۔ مجھے تمہارے دادا جان سے کیا سروکار رشتہ تمہاری ماں سے ہے۔ دادا کو میں کیا جانوں۔"

"اس قسم کا کمینہ پن میں برداشت نہیں کر سکتی۔"

"جہنم میں جاؤ۔" کہہ کر دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا تھا، اور شاہدہ ہیلو ہیلو ہی کرتی رہ گئی تھی۔ اسی وقت چلّی اندر پہنچا تھا اور شاہدہ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے کھنکارا تھا۔

وہ جھلا کر پلٹی اور دانت پیستی ہوئی بولی۔ "دماغ درست کر دیا ہے کُتیا کا۔"

"کس کا؟"

"اُسی ذلیل ناہید کا . . ."

"میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ناہید سے مجھے تمہارے دادا جان کے بارے میں نہیں معلوم ہوا تھا۔"

"میں یقین نہیں کر سکتی۔"

"مت کرو —" چلّی نے لاپروائی سے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ شاہدہ پیچھے پیچھے آئی تھی۔

"میں جا رہا ہوں . . ." چلّی نے اس طرف دیکھے بغیر کہا۔

"یہی بہتر ہو گا۔"

"لیکن تمہارے خاندان والوں کو زندہ درگور کر دوں گا۔"

"بہت دیکھے ہیں۔"

"طلاق نہیں دوں گا۔"

"مت دو۔۔۔ یہاں کون مانگتا ہے؟"

"یعنی۔۔۔ تم بدستور بیگم چلی پرریز کہلاتی رہو گی؟"

"بالکل۔۔۔ شادی تو میں نے اس لئے کی تھی کہ بعض پابندیاں ختم ہو جائیں۔"

"میں نہیں سمجھا۔۔۔"

"یہی کہ کنواری لڑکیوں کو یہ نہ کرنا چاہیئے اور کنواری لڑکیوں کو وہ نہ کرنا چاہیئے۔"

"یہ تم کہہ رہی ہو۔۔۔ جو مجھ پر ہزار جان سے فریفتہ تھیں۔"

"ذرا آئینے میں شکل دیکھو اپنی۔۔۔"

"کیا شیو بڑھا ہوا لگتا ہے؟"

"نہیں، ہونق لگ رہے ہو۔۔۔ ان پر میں ہزار جان سے فریفتہ تھی؟ خود بھاگے بھاگے پھرتے تھے میرے پیچھے۔"

"کچھ بھی سہی۔۔۔ لیکن گھر سے تو تم ہی بھاگی تھیں۔۔۔ اور میرے گھر میں نکاح ہوا تھا۔"

"حکمتِ عملی تھی ۔۔ تاکہ جلد از جلد مجھے کنوارے پن کی پابندیوں سے نجات مل جائے۔"

"غضب کی فراڈ نکلیں۔۔۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"اب سب کچھ سامنے آگیا ہے۔ لہٰذا جلد از جلد یہاں سے کوچ کر جاؤ۔"

چلی غصے میں بھرا ہوا اپنا سامان پیک کرنے لگا۔ عجیب دماغ پایا تھا شاہدہ نے۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے اس پر برہم تھی کہ رات کہیں اور کیوں گزاری اور اب قطعی طور پر دفع ہو جانے کو کہہ رہی تھی۔ اسی الجھن میں چلی کا غصہ فرو ہو گیا۔

سوٹ کیس بند کر کے اسی پر بیٹھ رہا۔ شاہدہ مسہری کی پٹی پر ٹکی ہوئی تھی۔

"بیٹھ کیوں گئے۔۔۔ اٹھاؤ سوٹ کیس۔"

"کیا تم واقعی سیریس ہو۔۔۔" چلی نے پھر ہاتھ پاؤں مارے۔

"بے غیرتی کی حد ہو گئی۔۔۔"

"دیکھو شاہدہ پچھتاؤ گی اگر چلا گیا۔"

"دراصل میں بھی یہی سوچ رہی ہوں کہ کہیں بعد میں مجھے پچھتانا نہ پڑے۔"

"خدا کا شکر ہے احساس تو ہوا۔" چلی نے طویل سانس لی۔

"تمہارے سلسلے میں نہیں کہہ رہی تھی۔"

"پھر۔۔۔؟" چلی نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس پر نہ پچھتانا پڑے جو میں تمہاری عدم موجودگی میں کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔"

"کیا کرنا چاہتی ہو میری عدم موجودگی میں۔"

"یہ نہیں بتا سکتی۔"

"تو پھر میں یہاں سے جا بھی نہیں سکتا۔"

"دراصل میں تجربہ کرنا چاہتی ہوں۔"

"کیا تجربہ؟"

"یہی کہ جو کچھ سوچتی رہتی ہوں اس پر عمل بھی کرسکتی ہوں یا نہیں۔"

"کیا سوچتی رہتی ہو؟"

"جو کچھ مرد کرسکتے ہیں وہی عورتیں کیوں نہیں کرسکتیں۔"

"میں نہیں سمجھا؟"

"مثلاً جیسے مرد غنڈہ گردی کرتے ہیں۔"

"تم ہوش میں ہو یا نہیں؟"

"بچپن ہی سے ایک خواب دیکھتی آئی ہوں۔"

"کیا خواب؟"

"یہی کہ میں نے تندرست اور طاقتور عورتوں کا ایک گروہ بنایا اور خود اس کی سردار ہوں۔ ہم ایک جیپ میں بیٹھ کر نکلی ہیں اور راہ چلتے مردوں کو اُٹھاتی پھر رہی ہیں۔"

"کیا میں بے ہوش ہوجاؤں۔" چلی نے گھٹی گھٹی سی آواز میں پوچھا۔

"تم . . . ." وہ اُسے غور سے دیکھتی ہوئی اور کچھ سوچتی ہوئی چٹکی بجا کر بولی۔ ایک صورت ہے۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"میں تمہیں برداشت کرلوں گی۔ اگر مجھ سے تعاون کرنے پر آمادہ ہوجاؤ۔"

"تمہاری کوئی بات میرے پلّے نہیں پڑ رہی۔"

"ابھی بتاتی ہوں۔" اس نے کہا اور پھر کچھ سوچنے لگی۔ چلی ہونقوں کی طرح اُسے دیکھے جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد شاہدہ بولی۔ "تم خواہ کسی کنجڑے ہی کی اولاد کیوں نہ ہو میں تمہیں برداشت کرلوں گی۔"

"بس اب ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکلے۔" چلی تنتنا کر کھڑا ہوگیا۔

"بیٹھو بیٹھو جلد بازی اچھی نہیں۔" شاہدہ ہاتھ ہلا کر بولی اور چلی غیرارادی طور پر بیٹھ گیا۔

"چار لڑکیاں میرا ساتھ دینے پر تیار ہیں۔ پانچویں میں خود ہوں۔ جیپ بھی موجود ہے اور میں اسے ڈرائیو کرسکتی ہوں۔"

"اچھا تو پھر؟"

"پہلے ریہرسل کیوں نہ کی جائے . . . ."

"یعنی . . . یعنی کہ مجھے . . . ." چلی ہنس پڑا۔

"خاموش رہو۔ میں سیریس ہوں۔" وہ بگڑ گئی۔

"لیکن یہ ہوگا کس طرح؟ چلی نے ہنسی میں بریک لگاتے ہوئے کہا۔

"بہت آسانی سے . . . تم خود کو ہمارے لئے اجنبی پوز کرو گے اور چپ چاپ اُٹھ جاؤ گے . . . ."

"تم پانچوں مل کر اٹھاؤ گی؟"

"اتنی بڑی لاش ایک آدھ کے بس روگ تو نہیں۔"

"اچھا . . . ." چلی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ پانچ عورتوں کے ہاتھوں اُٹھائے جانے کے تصور سے اسے کچھ سرور سا آچلا تھا۔

" دراصل ہم یہ دیکھیں گے کہ اس واردات سے دوسرے راہ گیروں پر کیا اثر ہوتا ہے . . . . وہ دخل اندازی کرتے ہیں یا دور سے کھڑے تماشا دیکھتے رہتے ہیں ۔"

" اگر پولیس نے دوڑایا تو — " چلی نے بے اندازہ دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے سوال کیا

" اوّل تو ہم کوشش کریں گے کہ پولیس کے ہاتھ نہ آسکیں اور اگر آ بھی گئے تو نہایت آسانی سے کہہ دوں گی کہ گھر سے بھاگے ہوئے شوہر کو پکڑ کر لے جا رہی ہوں ۔"

چلی سناٹے میں آگیا۔ پھر آہستہ سے اٹھا اور جھک کر سوٹ کیس اٹھاتا ہوا بولا " اچھا تو پھر پہلے مجھے گھر سے بھاگ جانے دو ۔"

" بیٹھو " وہ زور سے چیخی اور چلی بوکھلا کر پھر سوٹ کیس پر بیٹھ گیا۔

" اب تم نہیں جا سکتے . . . . بات پکی ہوگئی ۔ پہلے تمہیں گھر ہی میں اٹھانے کی مشق کی جائے گی ۔"

" کیا مطلب ؟ "

" فون کرکے اپنی چاروں سہیلیوں کو بلوائے لیتی ہوں ۔"

" شاہدہ ۔"

" کچھ بھی نہیں سننا چاہتی مشق تو ہو گی ۔"

" یہاں گھر میں ؟ " چلی بوکھلا کر بولا۔

" ہاں یہیں ہوگی ۔"

" تمہارے باپ بیمار ہیں . . . گھر میں ہنگامہ برپا کرو گی ؟ "

" نہایت خاموشی سے . . . اٹھاتے جاتے وقت شور مت مچانا ۔

جب سڑک پر سے اٹھانے جاؤ گے تو اس وقت جی بھر کے شور مچا لینا ۔"

" کیا تم سچ مچ پاگل ہوگئی ہو ۔"

" بکواس مت کرو۔ شادی میں نے اسی لئے کی تھی ۔"

" مجھے کھلونا بنانے کے لئے ۔"

" یہی سمجھ لو۔ عام آدمیوں کی ازدواجی زندگیوں میں کیا رکھا ہے ۔"

" مجھے تو عام سے بھی کمتر ہی سمجھ کر معاف ہی رکھو ۔"

" سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ۔"

" کیا تم سنجیدگی سے یہ باتیں کر رہی ہو ؟ "

" میری کھوپڑی میں کتے کا مغز نہیں ہے کہ خواہ مخواہ بھونکتی رہوں گی ۔"

" میں سڑک پر سے اٹھایا جانا ہرگز نہیں پسند کروں گا۔ گھر میں جو چاہو کر لو ۔"

" تم وہی پسند کرو گے جو میں چاہوں گی اور اب تم گھر سے باہر قدم نہیں نکال سکو گے ۔ نوکروں کو تمہارے بارے میں سختی سے احکام دیئے جائیں گے ۔"

" دنیا کیا کہے گی ؟ "

" دنیا کی ایسی تیسی ۔ ہم دنیا کے معاملات میں دخل دیتے ہیں کہ ہمیں دنیا کی پرواہ ہوگی ۔"

" آخر تم چاہتی کیا ہو ؟ " چلی نے ایک بار پھر ہاتھ پاؤں مارنے چاہے۔

" یہی تو سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا چاہتی ہوں ؟ بس یہ سمجھ لو کہ ہر آن کچھ نہ کچھ کرتی رہنا چاہتی ہوں۔ سوچے سمجھے بغیر . . . . حرکت کا نام زندگی ہے ۔"

"لیکن جو حرکت تم کرنا چاہتی ہو اس کا نام . . . اس کا نام . . ." چلی ہکلا کر رہ گیا۔ جملہ پورا کرنے کے لئے اُس کے ذہن میں کوئی لفظ نہ آسکا تھا . . .

"اسی کا نام زندگی ہے۔ معمولات تو مشینی طور پر سرزد ہوتے رہتے ہیں، وہ کرنا چاہیئے۔ جو کسی سے نہ ہوسکے . . . یہی ہے زندگی کا ثبوت۔"

"تم کس نفسیاتی بیماری میں مبتلا ہو۔"

"بس نفسیات کا نام نہ لینا ہڈیاں سُلگ جاتی ہیں۔"

"اچھا۔ میں کب تک گھر سے باہر قدم نہ نکال سکوں گا؟"

"جب میں کہوں گی تب۔"

پھر وہ کمرے میں چلی گئی تھی اور چلی وہیں بیٹھا اپنی گدی سہلاتا رہ گیا تھا۔

شام کو اتفاق سے اسے فون استعمال کرنے کا موقع مل گیا اسے علم تھا کہ چچا کن اوقات میں کہاں ہوتا ہے اور اس سے کس طرح فون پر رابطہ قائم ہوسکتا ہے۔

"کیا ہے، چلے۔ کیوں پریشان کرتا ہے . . ." دوسری طرف سے چچا ہی کی آواز آئی تھی۔

"نئی مصیبت چچا . . ." چلی نے بسور کر کہا اور تازہ پرابلم کے بارے میں بتانے لگا۔

چچا نے پوری بات سُن کر قہقہہ لگایا تھا۔

"تم ہنس رہے ہو . . ."

"خوشی کی بات ہے۔" چچا کی آواز آئی۔ "اس اسکیم میں میری طرف سے بھی اضافہ کرلو۔ نقلی پستول کا۔ جب وہ تمہیں سڑک پر سے اٹھا کر فرار ہونے لگیں تو نقلی پستول سے دو تین فائر بھی کرتی جائیں۔"

"میرا مذاق تو نہ اڑاؤ . . ." چلی نے کہا . . . لیکن دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہونے کی آواز آئی تھی۔

چلی کو وہ رات خوابگاہ میں تنہا گزارنی پڑی تھی، اس پر اس نے احتجاج بھی کیا تھا لیکن شنوائی نہیں ہوئی تھی۔

دوسری صبح ناشتے کی میز پر بھی شاہدہ سے ملاقات نہ ہوسکی، البتہ بڑی بی سر پر سوار تھیں۔

"اے میاں تم نے میرا کہا نہ مانا آخر۔" انہوں نے تیوری پر بل ڈال کر کہا۔

"کس طرح مانتا . . . ذرا نوکروں سے پوچھو۔ پابندی لگا دی گئی ہے کہ گھر سے باہر قدم نہ نکال سکوں۔"

"بٹیا نے لگائی ہے پابندی۔" بڑی بی چہک کر بولیں۔

"پھر کون لگاتا؟"

"تب تو پھر ٹھیک ہے . . ."

"کیا ٹھیک ہے . . ."

"ارے میں تو انہی کی وجہ سے کہہ رہی تھی . . ."

"ایک بات تو بتاؤ . . . بڑی بی"

وہ ہمہ تن توجہ بن گئیں۔

"یہ تمہاری بیٹا جو ہیں نا . . . ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آسکیں۔"

اس پر بڑی بی باچھیں پھاڑ کر ہنسی تھیں اور ہنستی ہی رہ گئیں تھیں۔ چلّی حیرت سے انہیں دیکھتا رہا۔

"اس پھیر میں نہ پڑیئے گا۔ ۔ ۔ بیٹا کچھ بھی ہوں۔ دل کی بُری نہیں ہیں۔"

"میں پوچھ رہا ہوں کہ دماغی حالت بھی درست ہے یا نہیں۔"

"اے میاں ایسی بد فال تو زبان سے نہ نکالتے۔ ۔ ۔ بس مزاج کا پتہ نہیں چلتا۔ کبھی شیر اور کبھی بھیڑ۔"

"آخر تم نے مجھے کہیں اور چلے جانے کا مشورہ کیوں دیا تھا؟"

بڑی بی کچھ نہ بولیں لیکن خاموشی کا انداز بھی ایسا تھا کہ چلّی کی الجھن بڑھ گئی۔ اس نے پھر اپنا سوال دہرایا اور بڑی بی ٹھنڈی سانس لے کر بولیں "اب کیا بتاؤں؟"

"پھر تم کیسی ہمدرد ہو میری۔"

"بس کیا بتاؤں بٹیا۔ تجربات۔"

"آپ کے والد صاحب کے خط کے بعد سے بٹیا کا مزاج بہت برہم ہو گیا ہے اور یہ آپ بھی جانتے ہیں کہ وہ بات بات پر تجربہ کرتی رہتی ہیں۔"

"میں نہیں جانتا۔"

"تجربات کا بھوت سوار رہتا ہے بٹیا پر۔ ۔ ۔ آپ کے والد کا خط پڑھ کر ایک دم بھڑک اٹھی تھیں کہنے لگیں۔ شادی کا تجربہ تو ہو گیا اب میں بیوہ ہو جانے کا بھی تجربہ کروں گی۔"

چلّی سناٹے میں آگیا۔ ٹھنڈا پسینہ سارے جسم سے پھوٹ پڑا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہکلایا "تت۔ ۔ ۔ تو پھر تم نے۔ ۔ ۔ مجھ پر پابندی عائد ہو جانے کی خبر سن کر خوشی۔ ۔ ۔ گگ۔ ۔ ۔ کیوں ظاہر کی تھی؟"

"اس وقت میں بھول گئی تھی کہ انہوں نے کیا کہا تھا؟" بڑی بی نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

"کیا وہ سچ مچ بیوہ ہو جانے کا تجربہ کر ہی ڈالیں گی۔"

"ابھی تک تو یہی دیکھا ہے کہ۔ ۔ ۔ جو کچھ کہہ دیا اسے کر بھی گزریں اے بیٹا۔ ۔ ۔ یہ شادی ہی کا معاملہ دیکھ لو۔ ۔ ۔ سب کو چھوڑ چھاڑ کر تمہارے ساتھ نکل گئی تھیں۔"

"پھر بتاؤ میں کیا کروں؟"

"بس کسی طرح نکل ہی جایئے۔"

"آخر بیوہ ہو جانے کا تجربہ کیسے کریں گی؟"

"ارے اس میں کیا رکھا ہے۔ ۔ ۔ بس چٹکی بھر زہر۔ ۔ تمہارے آگے پیچھے کوئی بیٹھا ہے کہ لاش کی ڈاکٹری کراتا پھرے گا۔"

"چلّی نے ہونٹ سکوڑ کر جھرجھری سی لی۔ ۔ ۔ اور جہاں تھا وہیں بیٹھا رہ گیا۔

اسی شام نہ جانے اچانک کیا ہوا کہ شاہدہ نے خود ہی اس سے باہر جانے کو کہہ دیا۔

"کیوں؟ ۔ ۔ ۔ آخر تم نے اپنا فیصلہ کیوں تبدیل کر دیا۔" چلّی نے سوال کیا تھا۔

"بس اسکیم بدل گئی ہے۔"

"کب۔ ۔ ۔ کیا آج ہی اٹھاؤ گی سڑک پر سے۔ ۔ ۔؟"

"میں نے کہہ دیا نا کہ اسکیم بدل گئی ہے۔"

"دیکھو دھوکے میں نہ رکھنا۔ پہلے سے بتا دینا جب اٹھانا ہو۔ ۔"

"اب جا بھی چکو" وہ جھنجھلا کر بولی۔

پھر چلّی نکل بھاگا تھا۔ ۔ ۔ جاتا کہاں ۔ ۔ ۔ سیدھے ہوسٹل کی راہ لی تھی۔ چچا سے زہر والا ماجرہ بیان کیا۔

"چلّے میں نے زندگی بھر کا ٹھیکہ تو لیا نہیں تھا۔" چچا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "بیوہ ہونا چاہتی ہے تو ہو جانے دو"

"۔ ۔ ۔ یعنی کہ میں مر جاؤں ۔ ۔ ۔"

"کیا فرق پڑتا ہے۔ تمہاری جگہ کوئی دوسرا شیخ چلّی لے گا۔ ۔ ۔"

"اتنے بے درد تو نہ بنو چچا"

"کیا چاہتے ہو" وہ بالآخر آنکھیں نکال کر بولا۔

"بڑی بی کے مشورے پر عمل کرنا چاہتا ہوں لیکن جاؤں کہاں؟"

چچا کسی سوچ میں پڑ گیا۔

تھوڑی دیر بعد سگریٹ سلگاتا ہوا بولا "آخر تم اتنے ڈرپوک کیوں ہو؟"

چلّی نے بھنّا کر کہا "اگر وہ کہتی کہ میں تمہیں قتل کرا دوں گی تو مجھے ذرہ برابر بھی فکر نہ ہوتی ۔ ۔ ۔ لیکن تم خود سوچو ۔ ۔ ۔ چپکے چپکے سے زہر یعنی مجھے پتا ہی نہ چل سکے گا کہ کب مر گیا۔

"اچھا ۔ ۔ بیٹا ۔ ۔ ۔ اس وقت تو یہیں پڑے رہو ۔ ۔ ۔ صبح کو دیکھیں گے" چچا نے بیزاری سے کہا۔

دوسری صبح چچا ہاتھ ہی نہ آسکا۔ نہ جانے کس طرف چل دیا تھا۔ چلّی نے جوں توں دو پیریڈ اٹینڈ کئے اور کالج سے بھاگ نکلا ۔ ۔ ۔ ناہید یاد آئی تھی ۔ ۔ ۔ آخر کوئی دکھڑا سننے والا بھی تو ہو ۔ ۔ ۔ ناہید سے فون

پر شاہدہ کی جھڑپ ہو چکی تھی لہٰذا چلّی کو توقع تھی کہ وہ بھی شاہدہ کے خلاف بھری بیٹھی ہو گی۔

اس کا اندازہ غلط نہیں نکلا تھا۔ ناہید نے اسے دیکھتے ہی پہلے تو بُرا سا منہ بنایا تھا لیکن پھر بولی تھی "آؤ ۔ ۔ ۔ آؤ ۔ ۔ ۔ آخر تم ہو کیا چیز؟"

"سب یہی پوچھتے ہیں مجھ سے؟" چلّی نے دردناک لہجے میں کہا۔

"تم نے میرا نام کیوں لیا تھا جب کہ میں نے تم سے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی"

"پتہ نہیں تم کیا کہہ رہی ہو ۔ ۔ ۔ کس نے نام لیا تھا تمہارا اور تم نے کیسی بات نہیں کی تھی۔"

"تمہاری بیگم صاحبہ کے دادا جان کے متعلق"

"تم نے" چلّی نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا "بھلا تم کیوں کرنے لگیں۔ کیا شاہدہ سے اس سلسلے میں کوئی بات ہوئی ہے"

"پھر کس سے ہوئی؟ بس فون پر جھگڑنے لگی تھی ۔ ۔ ۔"

"میں سمجھ گیا شاید اس سلسلے میں اسے تم پر شک ہوا ہے"

"کیا مطلب؟"

"ارے مجھے کنجڑے کی اولاد کہہ رہی تھی۔ مجھے بھی مرغی والا یاد آگیا ۔ ۔ ۔ اب یہ تو ہے نہیں کہ بعد میں بھی چھان بین نہ کرتا کہ کن لوگوں میں پھنس گیا ہوں ۔ ۔ ۔"

"تو یہ بات تھی ۔ ۔ ۔" ناہید نے طویل سانس لی۔

"میں خواہ مخواہ تمہارا نام کیوں لیتا"

"تو ہنگامے شروع ہو گئے۔ پتہ نہیں خود کو کیا سمجھتی ہے اب تو میں بھی ان لوگوں کی پوری ہسٹری بتاؤں گی۔ ہم لوگ کھرے پٹھان ہیں۔ ہمارے

نانا جان غلط فہمی میں پڑ کر پھنس گئے تھے۔

"ضرور یہی ہوا ہوگا . . . تمہاری شرافت و نجابت تمہارے چہرے سے عیاں ہے . . . سر فیاض والے قبیلے سے بالکل الگ معلوم ہوتی . . ."

"الگ ہوں۔ چلی پرویز . . ." وہ اسے غور سے دیکھتی ہوئی بولی۔

"تم کہیں اسے مذاق نہ سمجھ لو۔ لیکن یہ حقیقت ہے میں نے آج تک کسی مرد کی آنکھوں میں اتنی معصومیت نہیں دیکھی، جتنی تمہاری آنکھوں میں پائی جاتی ہے . . ."

"اس کی وجہ سے تو مجھ پر اتنے ظلم ڈھائے جاتے ہیں۔" چلی کا لہجہ پھر دردناک ہو گیا۔

"فکر مت کرو . . . کبھی کبھی راہ میں ایسے پتھر بھی آ جاتے ہیں کہ ٹھوکر لگانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ میں کئی دنوں سے سوچ رہی ہوں کہ تمہاری ایک پورٹریٹ کیوں نہ بناؤں . . ."

"آہا" چلی اچھل پڑا . . . "میں نے سنا ہے کہ تم بہت اچھی آرٹسٹ ہو . . . شاہدہ سے پوچھا تو کہنے لگی ہاں کیڑے مکوڑے بنا لیتی ہے۔"

"یہ کہا تھا اس نے؟"

"تم تو جانتی ہو کیڑے نکالنے کی عادت ہے اس میں۔"

"چلو میں تمہیں اپنی پینٹنگز دکھاؤں۔"

ناہید کی کوٹھی کا پھیلاؤ خاصے بڑے رقبے میں تھا . . . رہائشی عمارت سے اس حصے تک پہنچنے میں کئی منٹ صرف ہوتے تھے، جہاں ناہید کا اسٹوڈیو واقع تھا۔

"یہ در اصل مہمان خانہ ہے . . . جس کا ایک حصہ میرے استعمال میں رہتا ہے۔" ناہید نے وضاحت کی۔

"آپ لوگ مسٹر فیاض سے زیادہ دولت مند معلوم ہوتے ہیں۔" چلی نے کہا۔

"ہماری دولت پشتینی ہے . . . نو دولتے نہیں ہیں۔"

"میرا بھی یہی اندازہ تھا۔"

اسٹوڈیو میں پہنچ کر چلی دنگ رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بڑی آرٹ گیلری میں داخل ہوا ہو . . .

"یہ . . . یہ . . . ساری تصاویر آپ نے بنائی ہیں۔" اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

"جی ہاں۔ کیا یہ کیڑے مکوڑے ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔ آپ تو بہت بڑی آرٹسٹ معلوم ہوتی ہیں۔" ناہید گردن اکڑائے دوسری طرف دیکھتی رہی۔

"کیا آپ اپنی تصاویر کی نمائش نہیں کراتیں۔" چلی نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ سال میں چار مرتبہ . . ."

"کمال ہے مجھے اطلاع ہی نہ ہوسکی . . ." چلی نے ایسے انداز میں کہا جیسے آرٹ کا ایک بہت بڑا قدردان اب تک ناہید سے متعلق اندھیرے میں رہا ہو۔

"میرا خیال ہے کہ تم تنہائی پسند ہو۔ ورنہ تمہیں ضرور علم ہوتا۔" ناہید بولی۔

"ہاں شاید یہی بات ہے . . . ایک طرح سے غیر سوشل سمجھ لو۔"

"یہ اچھی بات نہیں ہے تمہیں لوگوں سے ملنا جُلنا چاہیئے . . . خیر اب میں تمہیں مختلف حلقوں میں متعارف کراؤں گی . . . ویسے تم آرٹ کے نقاد کیوں نہیں بن جاتے"

"بنا دو" چلی نے بے بسی سے کہا اور وہ اُسے شرارت آمیز نظروں سے دیکھتی ہوئی مُسکرا دی۔

"واقعی بہت بھولے ہو . . ."

"مم میں نہیں سمجھا . . ."

"اب اندازہ ہو رہا ہے کہ شاہدہ نے کس طرح تم پر چھاپہ مارا ہوگا" چلی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ باہر سے کسی انجن کا شور سنائی دیا۔

وہ چونک کر کھڑکی کی طرف مُڑا تھا اور دوسرے ہی لمحے میں اس کی روح فنا ہوگئی تھی۔

جیپ اسٹوڈیو کی طرف چلی آرہی تھی اور چلی اس پر بیٹھی ہوئی ان لڑکیوں کو صاف دیکھ سکتا تھا جن کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی چمکدار پھلوں والی کلہاڑیاں تھیں۔

شاہدہ جیپ ڈرائیو کر رہی تھی۔

"یہ کون ہیں ؟" ناہید نے حیرت سے کہا۔

جیپ رُکتے ہی لڑکیاں نیچے کود ی تھیں اور چلی کے سارے جسم میں تھرتھری پڑ گئی تھی . . .

تو یہ تھی تبدیلی، جو اصل اسکیم میں لائی گئی تھی . . . . اب کیا ہوگا۔

ناہید نے چلی کی طرف دیکھا اور وہ صرف تھوک نگل کر رہ گیا۔

چلی تو جانتا تھا کہ وہ کون ہیں، لیکن فاصلہ زیادہ ہونے کی بنا پر ناہید انہیں فوری طور پر پہچان نہیں سکی تھی۔ چلی نے یہ بات اس کی آنکھوں میں پڑھ کر موقع سے فائدہ اٹھانا چاہا۔

"شاید تمہاری سہیلیاں ہیں . . . مجھے کہیں چھپا دو" اس نے کہا۔

"ہاں . . . . اچھا . . . آؤ۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف مڑتی ہوئی بولی۔ ہر چند کہ وہ ایک ماڈرن لڑکی تھی۔ بھلا اسے اس کی کیا پرواہ ہوسکتی تھی، لیکن چلی کے لہجے نے گڑبڑا دیا۔ ویسے یہ اور بات ہے کہ چلی کا ہاتھ پاؤں مارنا بیکار ہی گیا ہو . . . چھپنے کی کوشش سے پہلے ہی شاہدہ کی دھاڑ سنائی دی تھی۔

"ٹھہر جاؤ"

وہ دونوں تیزی سے مڑے . . .

"یہاں کیا کر رہے ہو تم . . ." شاہدہ نے کلہاڑی ہلا کر جواب طلب کیا۔

"تت . . . تصویریں دیکھ رہا تھا . . ."

"تو پھر بھاگے کہاں جا رہے تھے"

"تم اجازت حاصل کئے بغیر اندر کیسے آئیں" ناہید نے نتھنے پھُلائے۔

"اُوہو — پیاری کزن . . . کیا مجھے بھی اجازت حاصل کرنے کی ضرورت ہے"

"ایسی صورت میں تو ہے" شاہدہ کی ایک سہیلی نے کلہاڑی سے چلی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"نکل جاؤ . . . . تم سب باہر نکل جاؤ . . . . ناہید چیختی ہوئی آگے بڑھی۔

"قدم آگے بڑھایا تو بُھٹہ سی گردن اُڑ جائے گی" شاہدہ کلہاڑی تان کر بولی تھی۔ اور چلّی کے گھٹنوں میں تھرتھری پڑ گئی تھی۔

اُدھر ایک لڑکی نے اپنی تینوں ساتھیوں کی کلہاڑیاں سنبھال لی تھیں اور وہ تینوں چلّی پر ٹوٹ پڑی تھیں۔

"ارے . . . ارے . . . یہ کیا مذاق"

"تم ہلیں اور میں نے کلہاڑی رسید کی" شاہدہ نے ناہید کو متنبہ کیا۔ بات مذاق کی حدود سے نکلی ہوئی لگی تھی ناہید کو۔ لہٰذا جہاں تھی وہیں دم بخود رہ گئی۔ چلّی کو ان تینوں نے فرش پر گرا دیا تھا اور اس پر چڑھی بیٹھی تھیں اور چلّی دل ہی دل میں حمد و ثنا کر رہا تھا پیدا کرنے والے کی . . . .
کیا کیا چیزیں کُتم عدم سے عالم میں وجود میں لایا اور مٹی کے پُتلے کو احساس کی وہ لذتیں بخشیں کہ . . . . "ارے باپ"

کسی نے اُس کا ٹینٹوا بھی دبانے کی کوشش کر ڈالی تھی شاید۔ چلّی کی کراہ پر شاہدہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

"ارے کم بختو یہ کیا ہو رہا ہے۔ اٹھا کر لے چلو جیپ میں" اُس نے انہیں للکارا۔ ناہید بُت بنی کھڑی رہی۔

"عورتوں پر میرا ہاتھ نہیں اٹھے گا چاہے وہ مجھے مار ہی کیوں نہ ڈالیں۔" چلّی نے اس وقت کہا جب ٹانگا ٹولی کر کے جیپ کی طرف لے جایا جا رہا تھا۔

"فکر مت کرو۔ میں تمہارا انتقام ضرور لوں گی" ناہید نے "ٹاٹا" کرنے کے سے انداز میں ہاتھ ہلا کر کہا تھا۔

"تم کس بات کا انتقام لوگی بی لومڑی" شاہدہ نے آنکھیں نکال کر پوچھا۔

"اس ظلم کا جو تم لوگوں نے اس معصوم پر ڈھایا ہے اور اب مسلسل ذلیل کئے جا رہے ہو"

"تمہارا کون لگتا ہے . . . ."

"محبوب" ناہید اکڑ کر بولی۔

"سر پر اُسترہ پھیر دوں گی"

"حجام خاں صاحب کی پوتی بھلا اور کیا کرے گی"

شاہدہ نے طیش میں آکر کلہاڑی گھما دی۔ ناہید اچھل کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔

اور پھر اُس نے تارپین کے تیل کا ڈبہ اٹھایا تھا اور شاہدہ کے منہ پر کھینچ مارا تھا۔

پھر کلہاڑی اُس کے ہاتھ سے چھوٹی ہی تھی کہ ناہید نے اس پر چھلانگ لگا دی۔ اِدھر ان دونوں میں دھینگا مشتی ہو رہی تھی اور اُدھر وہ تینوں چلّی کو جیپ پر دبوچے بیٹھی تھیں۔

"ارے . . . . وہ دونوں لڑ پڑی ہیں" اُن میں سے ایک نے کہا، اور چلّی پر گرفت کسی قدر ڈھیلی ہو گئی۔

"مجھے اسی طرح دبوچے بیٹھی رہو . . . . ورنہ میں بھاگ جاؤں گا" چلّی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

"ہمیں شاہدہ کی مدد کرنی چاہیئے" دوسری بولی۔

"ارے نہیں نہیں! میں واقعی بھاگ جاؤں گا۔ یہ محض دھمکی نہیں ہے"

"میں دیکھ رہی ہوں ناہید کمزور پڑ رہی ہے۔" تیسری نے کہا۔

"بیکار اِدھر اُدھر دیکھ رہی ہو۔" چلّی جلدی سے بولا۔ "مجھ پر توجہ رکھو کہیں تم تینوں کو دھکیل کر بھاگ نہ جاؤں۔"

"تم نہیں بھاگ سکتے۔"

"اُسی صورت میں جب تم تینوں ہی مجھے جکڑے رکھو۔"

"ناہید تمہیں یہاں کیوں لائی تھی؟"

"میں خود آیا تھا۔ وہ کیوں لاتی۔"

"تم کیوں آئے تھے؟"

"اس کی بنائی ہوئی تصویریں دیکھنے۔ . ."

"بڑی بنانے والی۔ . . میں جانتی ہوں۔ . . ٹھیکے پر بنواتی ہے۔ . ."

"کیا مطلب؟"

"دو تین مفلس آرٹسٹ پکڑ رکھے ہیں۔ . ."

"واہ۔ . . میں نے ایزل پر ایک نامکمل تصویر بھی دیکھی ہے۔"

"وہ بھی کسی سے بنواتی ہے۔ جب کسی مہمان کو اسٹوڈیو میں لاتی ہے تو اُس سے گفتگو کرتے وقت بڑے اسٹائل سے برش اٹھا اٹھا کر صرف بیک گراؤنڈ میں رنگ لگاتی رہتی ہے۔"

چلّی کچھ نہ بولا۔ اسٹوڈیو میں اب بھی ہڑبونگ جاری تھی۔ دونوں چیخ چیخ کر ایک دوسرے کی ہسٹری دُہراتے جا رہی تھی۔

چوتھی جو چاروں کلہاڑیوں سمیت اگلی سیٹ پر تھی مضطربانہ انداز میں بولی۔ "دراصل مجھے لڑائی جھگڑائی کا کوئی عملی تجربہ نہیں ہے ورنہ میں شاہدہ کی

مدد کرتی۔ . ."

"تو تم یہاں چلی آؤ۔ . ." چلّی نے کہا۔ "ان میں سے کوئی مدد کو چلی جائے گی۔ . . دراصل میں تین کے قابو میں نہیں رہ سکتا۔"

"افسوس کہ مجھے اس کا بھی کوئی عملی تجربہ نہیں ہے۔" چوتھی ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"تو پھر گھر سے کیوں نکل پڑی تھیں۔ . ." چلّی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تمہارے مشوروں کی ضرورت نہیں ہے۔ چپ چاپ بیٹھے رہو۔"

"لو بھئی اِدھر انہوں نے جھگڑا شروع کر دیا۔"

"تم چپ چاپ بیٹھے کیوں نہیں رہتے؟" ایک نے کہا۔

"کمال کر دیا تم نے۔ . . اگر وہ دونوں بہت زیادہ زخمی ہو گئیں تو؟"

"اچھا جاؤ۔ بات ختم کرو۔ میں صرف دو ہی کے قبضے میں رہ لوں گا تھوڑی دیر تک۔"

"جھوٹا وعدہ تو نہیں ہے؟"

"مردوں کی زبان ایک ہوتی ہے۔ کوئی ایسا ویسا سمجھا ہے تم نے۔" چلّی غصیلے لہجے میں بولا۔ وہ جیپ سے کود کر اسٹوڈیو کی طرف جھپٹی۔

"دیکھو! زیادہ خون خرابہ نہ ہونے پائے۔" اگلی سیٹ والی نے کہا۔ "اب بیچ بچاؤ کا وقت ہے۔"

"یہ تو بے حد ڈرپوک معلوم ہوتی ہے۔" چلّی نے دونوں سے کہا جو اُسے جکڑے بیٹھی تھیں اور وہ دونوں ہنس پڑیں۔

"بھلا اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔" چلّی نے حیرت سے کہا۔

"وہ فلسفہ پڑھتی ہے اور اُس نے اپنے والدین سے مشورہ کر رکھا ہے کہ

جدوجہد للبقا میں بالکل حصّہ نہیں لے گی ۔"

"یہ کیا ہوتی ہے ۔"

"یہ تو میں بھی نہیں جانتی . . . اِسی نے بتایا تھا ۔"

"یہ کیا چیز ہے صوفیہ ۔" دوسری نے پوچھا۔

"ارتقا کی تھیوری میں پڑھ لو میرے پاس سمجھانے کا وقت نہیں ہے ۔"

تمہیں اس وقت کون سی مصروفیت ہے کہ وقت نہ ہونے کا رونا رو رہی ہو ۔"

"تم غلط سمجھی میرے پاس رونا رونے کا بھی وقت نہیں ہے ۔"

"واقعی فلاسفر معلوم ہوتی ہیں ۔" چلّی آہستہ سے بولا۔

"میرے پاس کچھ معلوم کرنے کا بھی وقت نہیں ہے ۔" اگلی سیٹ والی نے کہا۔

"اب کچھ نہ کہنا ۔" چلّی نے اُن دونوں سے کہا ۔ "یہ انتہا تھی ۔"

پھر انہوں نے شاہدہ کو اسٹوڈیو سے برآمد ہوتے دیکھا! اُس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ سر کے بال جھاڑ جھنکاڑ ہو رہے تھے اور وہ لڑکھڑاتی ہوئی جیپ کی طرف بڑھی آ رہی تھی۔ تیسری لڑکی نے بائیں ہاتھ سے اُس کی کلہاڑی سنبھال رکھی تھی اور داہنے سے اُسے سہارا دے رہی تھی . . .

ناہید دروازے پر کھڑی نظر آئی۔ اس کی حالت بھی شاہدہ سے مختلف نہیں تھی اور وہ مسلسل کہے جا رہی تھی ۔ "دیکھ لوں گی کُتیا نہیں . . . دیکھ لوں گی اگر اُسے کوئی گزند پہنچا . . ."

لیکن نہ وہ آگے بڑھی تھی اور نہ شاہدہ ہی نے پلٹ کر کچھ کہا تھا۔ نیم بیہوشی کے سے عالم میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی تھی اور چوتھی لڑکی صوفیہ نے

انجن اسٹارٹ کیا تھا۔

چلّی خاموش رہا۔ خود سے شاہدہ کو نہیں چھیڑنا چاہتا تھا وہ اگلی سیٹ پر بیٹھی ہانپتی رہی۔

گاڑی تیز رفتاری سے کسی نامعلوم منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ گھر کا راستہ تو نہیں معلوم ہوتا تھا! چلّی کا دل چاہا تھا کہ پوچھ لے لیکن پھر ہمت نہ پڑی۔

فلاسفر لڑکی شاہدہ سے کہہ رہی تھی ۔ "تمہیں کیا ملا اس تگ ودَو سے . . .؟"

"دماغ دُرست کر دیئے کُتیا کے ۔" شاہدہ ہانپتی ہوئی بولی۔

"خود بھی تو ٹوٹ پھوٹ گئی ہو ۔"

"کیا فرق پڑتا ہے . . ."

"میں تمہیں اپنے گھر لے جا رہی ہوں ۔"

"کیوں ؟"

"میرے کپڑے تم پر فٹ آ جاتے ہیں . . . ان پھٹے حالوں اپنے گھر گئیں تو لوگ کیا سمجھیں گے ۔"

"اس کا تو دھیان ہی نہیں تھا ۔"

"اور اپنے گھر لے جانے کی ہمت اس لیئے کر رہی ہوں کہ اس وقت گھر خالی ہے۔ سب لوگ ایک تقریب میں شرکت کے لیئے گئے ہوئے ہیں ۔"

چلّی کو سخت حیرت تھی کہ شاہدہ اس کی طرف متوجہ نہیں ہو رہی ۔ اُسے تو پھاڑ کھانا چاہیئے تھا۔

"کیا تم سو رہے ہو ۔" دفعتاً ایک لڑکی اُسے جھنجھوڑ کر بولی۔

"تمہیں کیا تکلیف ہے ۔" چلّی نے بگڑ کر کہا ۔ "بور ہو کر سوؤں گا نہیں تو کیا چھلانگیں لگاؤں گا ۔"

"مجھے افسوس ہے ڈارلنگ" اگلی سیٹ سے شاہدہ کی آواز آئی۔
"کیا مجھ سے کچھ کہہ رہی ہو" چلی چونک پڑا۔
"تمہارے علاوہ اور کسے ڈارلنگ کہہ سکتی ہوں" چلی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔ لہٰذا اُس نے اپنا سوال دُہرایا۔
"ہاں ہاں میں تم سے مخاطب ہوں"
"اور پوری طرح ہوش میں بھی ہوں"
"کیا تم دیکھ نہیں رہے ۔ ۔ ۔ ؟"
"یعنی ۔ ۔ ۔ میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا" چلی نے بے بسی سے کہا۔
"میں نا انصاف نہیں ہوں ۔ ۔ ۔"
"بات پلے ہی نہیں پڑ رہی"
"اچھی بات ہے تو پھر فی الحال خاموش رہو" وہ جھلا کر بولی۔
"میں تو خاموش ہی تھا لیکن تمہی خواہ مخواہ ڈارلنگ وارلنگ کرنے لگی تھیں"
"لوگ الفاظ ضائع کرنے کے عادی ہو گئے ہیں" فلاسفر لڑکی صوفیہ کی آواز آئی۔
"تمہاری باتیں زہر لگتی ہیں مجھے تم خاموش رہو" چلی نے غصیلے لہجے میں کہا۔
"تم نے ایک بیوقوف آدمی سے شادی کی ہے شاہدہ" صوفیہ سرد لہجے میں بولی۔
"بے موقع بکواس سے احتراز کرو" شاہدہ نے کہا۔
"ٹھیک ہے مجھے کیا۔ اگر تمہیں بیوقوف ہی پسند ہے"

"تم تو افلاطون سے بیاہی جاؤ گی شاید" چلی نے ہانک لگائی۔
"وہ بھی بے وقوف ہی تھا"
"عقل مند تو صرف تمہارے والد صاحب معلوم ہوتے ہیں"
"اس سے بڑی بے وقوفی کیا ہو گی کہ میرے باپ ہیں"
"آخر تم خود کو سمجھتی کیا ہو؟"
"ایک بیوقوف کی بیٹی"
"خود کیا ہو"
"کہہ تو دیا کہ ایک بیوقوف کی بیٹی"
"تمہاری والدہ کی طرف سے بیوقوف ہیں یا سو فی صد اپنی ذمہ داری پر"
"چپ بھی رہو ڈارلنگ" شاہدہ بول پڑی "آپس میں جھگڑنے سے کیا فائدہ"
"میں ان محترمہ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر انہوں نے پیدا ہونے سے انکار کیوں نہیں کر دیا تھا"
"تم بات بڑھا رہے ہو۔ چپ بھی رہو"
"میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ تمہاری یہ سہیلی زمین کا بوجھ ہیں۔ انہیں کسی بات کا کوئی عملی تجربہ نہیں ہے۔ بس یوں ہی ٹائیں ٹائیں کیا کرتی ہیں"
"میں اب تمہیں اپنے گھر نہیں لے جاؤں گی شاہدہ" صوفیہ آپے سے باہر ہوتی ہوئی بولی۔
"ارے نہیں۔ آخر کیوں؟" شاہدہ بوکھلا گئی۔

"بس یہ ہماری دوستی کا آخری دن ہے"

"کیسی اُلٹی سیدھی باتیں کر رہی ہو"

"تم خواہ مخواہ اپنے الفاظ ضائع نہ کرو۔ میں تمہیں اپنے گھر اسی صورت میں لے جاسکتی ہوں جب یہ شخص ہمارے ساتھ نہ ہو"

"سہیلی کے شوہر کو یہ شخص کہہ رہی ہو" چلّی تڑپ کر بولا۔

"تم چُپ رہو" شاہدہ جھلا کر پلٹی "میں اس بھٹے حالوں گھر نہیں جاسکتی۔

"اچھا تو پھر مجھے گاڑی سے اتار دو جیسا کہ یہ عورت کہہ رہی ہے"

"میں عورت نہیں لڑکی ہوں . . ." صوفیہ نے غصیلے لہجے میں کہا۔

"غلطی ہوئی محترمہ" چلّی نے جلے کٹے انداز میں کہا" اگر چالیس کی عمر تک شادی نہ ہو تو لڑکی عورت ہی کہلاتی ہے"

"میں تمہیں چالیس سال کی نظر آتی ہوں" وہ زور سے چیخی۔

"نظر تو چار سو سال کی آتی ہو۔ بیوی کی سہیلی سمجھ کر مُروّت میں چالیس سے آگے نہیں بڑھا تھا"

صوفیہ نے سڑک کے کنارے گاڑی روک دی اور شاہدہ سے بولی۔

"اپنے شوہر کو گاڑی سے اتار دو"

"ارے واہ" چلّی ہاتھ نچا کر بولا" ابھی تو صرف ایڈون ہوا ہے چر بھی تو کرو۔

"یہ کیا بک رہا ہے تمہارا شوہر"

"پورا ایڈونچر چاہیئے مجھے" شاہدہ کے بولنے سے پہلے ہی چلّی بول پڑا۔

صوفیہ اور شاہدہ کے علاوہ سبھی ہنس پڑی تھیں۔

"اچھا تو پھر میں خود ہی اُتر جاتی ہوں" صوفیہ بولی۔

"نہیں۔ نہیں" شاہدہ مضبوطی سے اس کا بازو پکڑتی ہوئی بولی تھی اور چلّی کی طرف دیکھے بغیر کہا تھا" تم اتر جاؤ گاڑی سے"

"کیا مجھ سے کہہ رہی ہو . . ." چلّی نے بے اعتباری سے پوچھا۔

"ہاں تم سے کہہ رہی ہوں"

"اور پھر اتنی اچھل کود مچانے کی کیا ضرورت تھی۔ فون کر دیا ہوتا کہ ناہید کے اسٹوڈیو سے نکل کر سیدھے گھر پہنچ جاؤ۔ خیر۔ خیر۔ میں جا رہا ہوں"

"تنہا نہیں . . . یہ تینوں بھی۔ تمہیں اپنی نگرانی میں گھر پہنچائیں گی"

"جیسی تمہاری مرضی" چلّی بظاہر مردہ سی آواز میں بولا لیکن دل میں تو سرور و انبساط کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا تھا۔

"تم اکیلے نہیں۔ یہ تینوں بھی . . . واہ . . . بیوی ہو تو ایسی ہو"

شاہدہ نے اپنی تینوں سہیلیوں کو چلّی سے متعلق کچھ ہدایات دی تھیں اور انہیں گاڑی سے اتار دیا تھا۔

پھر جب تک گاڑی روانہ نہیں ہوگئی تھی وہ چاروں فٹ پاتھ پر کھڑے رہے تھے۔

"سخت مایوسی ہوئی ہے" چلّی بُرا سا منہ بنا کر بولا۔

"کیوں؟" تینوں اُسے گھورنے لگیں۔
"یہ بھی کوئی ایڈونچر ہوا۔"
"ہاں کچھ پھُس سے ہو کر رہ گیا ہے۔" دوسری نے کہا۔
"تم چاہو تو اس میں جان پڑ سکتی ہے۔"
"وہ کس طرح"
"یہیں کھڑے کھڑے بتا دوں۔ ارے چلو کہیں بیٹھتے ہیں کسی ریستوران میں۔"
"نہیں نہیں۔ ۔ ۔ گھر چلو" تیسری جلدی سے بولی۔
"نقالی کرتی ہو امریکن لڑکیوں کی لیکن رگوں میں خون کی بجائے لعوق سپستان دوڑ رہا ہے۔"
"کیا کہنا چاہتے ہو۔"
"کچھ نہیں جاؤ چولہا ہانڈی کرو۔"
"تم ہماری توہین کر رہے ہو۔"
"ہو ہی اسی قابل۔ ۔ ۔"
"آخر کیوں؟ کہنا کیا چاہتے ہو۔"
"اگر تمہاری جگہ امریکن لڑکیاں ہوتیں تو مجھے گھر پہنچانے کی بجائے غائب کر دیتیں۔"
"کیا مطلب۔"
"اور پھر وہ ہوتا حقیقی ایڈونچر۔"
"لل۔ ۔ ۔ لیکن تمہیں کیسے غائب کیا جا سکتا ہے۔"
"یہ بھی مجھی سے پوچھو گی۔ ہاں ہاں کہہ دو کہ تمہیں بھی اس کا عملی تجربہ

نہیں ہے۔"
"واقعی نہیں ہے۔"
"مجھے کہیں اور لے چلو۔"
"کہاں لے چلیں۔"
"جہاں دو تین دن تک بند رکھ سکو۔"
تینوں نے حیرت سے ایک دوسری کی طرف دیکھا تھا اور پھر چلّی کو گھورنے لگی تھیں۔
"شاید سمجھی نہیں"
انہوں نے مایوسی سے نفی میں سر ہلاتے تھے۔
"مجھے اغوا کر لو۔"
"کیوں فضول باتیں کرتے ہو۔"
"مت کرو امریکن لڑکیوں کی نقالی۔ ۔ ۔ گھر بساؤ میاں لوگوں کے اور سنبھالو پاندان۔"
"اچھا کس طرح کریں اغوا۔" ایک نے سوال کیا۔
"کہہ تو دیا کہ گھر پہنچانے کی بجائے خود قبضہ کر لو۔ ۔ ۔ مجھ پر۔ شاہدہ سے کہہ دینا کہ مجھے پھاٹک پر چھوڑ کر خود اپنے گھروں کو چلی گئی تھیں۔"
"اس سے کیا ہوگا۔ ۔ ۔ یعنی نتیجہ کیا نکلے گا اس کا۔"
"آمدنی۔ ۔ ۔"
"صاف صاف کہو۔"
"اس سے کہا جائے گا کہ اُس کا عزیز از جان شوہر خطرناک لوگوں کے قبضے میں ہے اور وہ خطرناک لوگ ایک بڑی رقم وصول کئے بغیر اُسے نہیں

چھوڑیں گے۔"

"کتنی رقم"

"تم لوگ خود ہی مقرر کر دو رقم بھی۔"

وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی تھیں، دفعتاً ایک لڑکی زور سے ہنس پڑی۔

دونوں نے اُسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"یہ حضرت ہمیں جُل دے کر نکل جانا چاہتے ہیں۔" اُس نے کہا۔

"اچھا۔ ۔ ۔ اچھا۔ ۔ ۔" ان دونوں نے معنی خیز نظروں سے چلّی کی طرف دیکھا۔

"جب تین ناقص العقل اکٹھا ہو جائیں تو چوتھا بھی بیوقوف ہو کر رہ جائے گا۔"

"کیا بات ہوئی۔"

"کچھ نہیں، یہاں کی عورت کبھی ترقی نہیں کر سکتی۔"

"چلو یہی سہی اب تم گھر چلو۔"

"ایڈونچر۔ پوہ۔" کیا۔

"ہاں ایڈونچر۔ کیا یہ ایڈونچر نہیں تھا۔"

"اُف۔ ۔ ۔ فوہ۔ ۔ ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے مجھے ڈاکوؤں کے پھندے سے بچا لاتی ہوں۔ وہ بیچاری ایک سیدھی سادی آرٹسٹ مجھے اپنی تصویریں دکھا رہی تھی۔"

وہ تینوں ہنس پڑی تھیں اور پھر ایک نے کہا تھا "بیچارے کو کچھ پتہ ہی نہیں ہے۔"

"کیا پتا نہیں ہے؟"

"سب ٹھیک ہے چلو۔ ۔ ۔"

"کیا پیدل ہی" چلّی جھنجھلا کر بولا۔

"ٹیکسی کر لو۔ لیکن ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔"

"تو میں کون سا قارون کے خزانوں پر بیٹھا ہوا ہوں۔ ۔ ۔ واہ بھئی۔ ۔ ۔ اس طرح اٹھایا بھی جاؤں اور ٹیکسی کا کرایہ بھی خود ہی ادا کر دوں۔ ۔ ۔"

"آپ کی بیگم صاحبہ کرایہ نہیں دے گئیں۔ ۔ ۔ پیدل ہی چلنا پڑے گا۔"

"کیا سچ مچ تمہاری جیب میں کچھ نہیں ہے۔" ایک لڑکی نے چلّی سے تحقیر آمیز لہجے میں پوچھا۔

اُس کے جواب دینے سے پہلے ہی دوسری بولی۔ "جلا وطن شہزادے ہیں۔ ۔ ۔ بادشاہ سلامت نے عاق بھی کر دیا ہے۔ ۔ ۔"

"ذاتیات پر حملہ کیا تو مجھے یہاں سے ہلا بھی نہ سکو گی۔" چلّی آنکھیں نکال کر بولا۔

"کیوں گڑبڑ کر رہی ہو۔" تیسری نے اُس سے کہا جس کی باتوں پر چلّی بگڑ گیا تھا۔

"مجھے نفرت ہے اس طبقے سے۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ آپس میں لڑ کر فنا ہو جائیں۔"

"تم کس طبقے سے تعلق رکھتی ہو۔" چلّی نے سوال کیا۔

"جاگیردار یا سرمایہ دار طبقے سے میرا تعلق نہیں ہے۔ ۔ ۔" وہ نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر بولی۔

"تب پھر شاہدہ سے تمہاری دوستی میں نہیں آتی اس کا باوا بھی خطاب یافتہ ہے . . . سروں اور نوابوں کے زمرے میں شامل ہے۔"

"میں اس طبقے کی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہتی ہوں . . ."

"سب کہنے کی باتیں ہیں۔ مجھے دیکھو . . . میں ہوں اصلی والا سوشلسٹ"۔

"کیا مطلب . . ."

"داڑھی اور شادی کے قصے بکواس ہیں۔ دراصل میں نے مزارعین پر مظالم کے خلاف آواز اٹھائی تھی اسی لئے عاق کر دیا گیا ہوں . . . بھلا داڑھی اور شادی میں کیا رکھا ہے۔"

"ت . . . تو . . . تم سوشلسٹ ہو۔"

چلّی نے سوچا "ہاں" کر دینے میں کیا مضائقہ ہے جب کہ آہستہ آہستہ سارے ہی جاگیردار اور سرمایہ دار سوشلسٹ ہوتے جا رہے ہیں۔

"ہاں۔ میں سوشلسٹ ہوں۔"

"تو پھر شاہدہ سے شادی کیوں کر لی۔"

"لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے لئے۔ تمہاری طرح میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ یہ طبقات آپس ہی میں لڑ لڑ کر فنا ہو جائیں . . . کیا شاہدہ نے تمہیں وہ خط دکھایا تھا، جو میرے ابا حضور نے سر فیاض کو لکھا ہے۔"

"ہاں دکھایا تھا۔"

"اس طرح میں نے دو جاگیرداروں کو لڑوا دیا۔ عنقریب ابا حضور دو ڈھائی درجن گنواروں کی فوج یہاں بھیجیں گے، جو سر فیاض کی کوٹھی کو تہس نہس کر کے رکھ دے گی۔"

"واقعی" اس لڑکی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"ہاں کامریڈ"

"تب۔ تو۔ تب تو تم اپنوں ہی میں سے ہو۔ اچھا میں تمہیں بتاتی ہوں کہ اصل قصہ کیا ہے . . ."

"فاخرہ" دوسری لڑکی نے آنکھیں نکالی تھیں۔

"تم چپ رہو۔ اپنے کیمپ سے تعلق رکھنے والے کسی آدمی کو دھوکہ نہیں دے سکتی۔" فاخرہ نے تیز لہجے میں کہا۔

"یہ حضرت اوّل درجے کے چھوٹے ہیں۔ شاہدہ کے لئے روتے پھرتے تھے۔"

"وہ حکمتِ عملی تھی۔" چلّی ڈھٹائی سے بولا۔ "خالص ڈپلومیسی۔"

"میں تمہیں بتاتی ہوں . . ." فاخرہ نے پھر اسٹارٹ کی۔

"تم اچھا نہیں کر رہیں . . . شاہدہ سے دوستی کا تو خیال کرو۔"

"میں صرف اپنی آئیڈیالوجی کی وفادار ہوں۔"

"جہنم میں جاؤ۔"

"خواہ مخواہ مری جا رہی ہو۔" فاخرہ نے کہا۔ "ادھر دیکھو . . . کیا تم اتنے چاند سے مکھڑے پر دوبارہ داڑھی دیکھنا پسند کرو گی۔"
اُس نے چلّی کے چہرے کی طرف اشارہ کیا تھا . . .

"ن . . . نہیں . . ." وہ کسی قدر ہچکچاہٹ سے بولی۔ چلّی کے چہرے پر اس کی نگاہ جم کر رہ گئی تھی۔

"تو پھر ان پر یہ ظلم نہ ہونا چاہئے۔ ہم کہہ دیں گے کہ پیدل گھر کی طرف جا رہے تھے، یہ ایک طرف نکل بھاگے۔"

چلّی الجھن میں پڑ گیا۔ آخر فتنہ کیا ہے اس پر ایسا کون سا ظلم ہونے والا

ہئے جسے یہ کامریڈ پسند نہیں کرے گی . . . اور پھر یہ داڑھی کا حوالہ کیا۔

تھوڑی سی بحث و تکرار کے بعد بالآخر تینوں اس پر متفق ہو گئیں تھیں کہ چلّی کو اصل بات بتا دی جائے ۔

"سنو" فاخرہ بولی " بات دراصل یہ ہے کہ اب تم قید کر دیئے جاؤ گے اور اُس وقت تک قید رہو گے جب تک کہ ویسی ہی داڑھی دوبارہ نہ تیار ہو جائے جیسی پہلے تھی "

"اور سنو" ایک نے کہا اور وہ سب ایک دوسری کو معنی خیز نظروں سے دیکھتی ہوئی ہنس پڑی تھیں ۔

"ارے بی بیو کچھ بتاؤ گی بھی یا یونہی ہنسے جاؤ گی۔ رحم کرو مجھ نامراد پر "

"تمہاری سادگی پر ہنس رہے تھے " فاخرہ نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا " بُری کے پنجے میں پھنسے ہو "

"پہلے کسی نے بھی نہیں بتایا تھا . . ."

"پہلے تم ہمیں ملے کب تھے۔ ورنہ شاہدہ ہاتھ ڈال سکتی تھی تم پر "

"اب تو مل گیا ہوں" چلّی روہانسا ہو کر بولا۔

"اب سوائے ہمدردی کے کیا کر سکتے ہیں "

"ارے اس سے کرھی چیکو ہمدردی "

"اسکیم یہ ہے جب تمہاری پوری داڑھی نکل آئے گی تو تمہیں پتلی موریوں کی ٹخنوں سے اونچی شلوار پہنا کر تمہارے آبائی گاؤں لوٹ ہے لوٹا کی طرف روانہ کر دیا جائے گا اور تمہارے باوا کو لکھا جائے گا کہ بواپسی ڈاک رسید سے مطلع فرمایئے "

"نہیں۔ تم مذاق کر رہی ہو "

"پیدا کرنے والے کی قسم۔ یہی ہو گا۔ زبردستی بھیجے جاؤ گے . . . دو پہلوان تمہارے ہمراہ ہوں گے کہ چوں بھی نہ کر سکو "

"یہ تو انتہائی غیر سوشل حرکت ہو گی " چلّی نے پر تشویش لہجے میں کہا۔

"ہو گا یہی، اسے لکھ لو "

"سوشل ازم کے کاز کو نقصان پہنچے گا اس سے "

"اسی لئے تو . . ."

"پھر سوچ لو " ایک لڑکی نے فاخرہ کو ٹوکتے ہوئے چلّی سے کہا۔

"فضول ہے تم شاہدہ کی دستبرد سے نہیں بچ سکتے "

"میں بچاؤں گی" فاخرہ گردن اکڑا کر بولی ۔

"میں بھی تو سنوں کیسے بچاؤ گی "

"پندرہ دن کا انتظام تو میں کر سکتی ہوں۔ یعنی پندرہ دن کے لئے چلّی صاحب غائب "

"اوہ - خدا کی بندی پھر جلدی کرو . . . کہیں وہ پلٹ نہ پڑے " چلّی بے صبری سے بولا۔

"کیا انتظام کرو گی " ایک لڑکی نے پوچھا۔

"تم چپ ہی رہو " چلّی نے کہا " جو کچھ کرتی ہیں کرنے دو "

"نہیں ٹھہرو۔ بتا ہی دوں انہیں۔ سعیدہ کے گھر والے شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ مکان خالی ہے۔ کنجی میرے پاس ہے۔ وہ لوگ ایک ماہ کے لئے گئے ہیں۔ اس لئے میں نے احتیاطاً پندرہ ہی دن کی بات کی ہے "

"تو تم انہیں سعیدہ کے مکان میں رکھو گی "

"کیا حرج ہے۔ مکان کی نگرانی بھی ہوتی رہے۔"

"بالکل۔ بالکل" چلی جلدی سے بولا "بالکل چوکیداروں کی طرح نگرانی کروں گا۔"

"لیکن کھاؤ گے کہاں سے۔ تم کہتے ہو کہ تمہارے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں" وہی لڑکی بولی۔

"دیکھا جائے گا۔ فی الحال سر چھپانے کو جگہ چاہیئے۔"

بس پھر چلی کو اس مکان میں پہنچا کر تینوں لڑکیاں سر فیاض کی کوٹھی کی طرف دوڑ گئی تھیں۔

. . . .

چھ کمروں پر مشتمل خاصی کشادہ عمارت تھی۔ فون بھی موجود تھا۔ چلی نے کسی قدر اطمینان کا سانس لیا۔ . . کم از کم چچا کو تو اپنے احوال سے آگاہ کر سکے گا۔

خوش قسمتی سے وہ اُسی نمبر والے فون پر مل گیا تو جو اُس نے پہلی بار ڈائیل کئے تھے لیکن چلی کی آواز پہچانتے ہی چچا کسی کٹکھنے کُتے کی طرح غرایا۔

"ابے اب کیا اپنی قبر میں بھی مجھے ساتھ لے جائے گا" دوسری طرف سے آواز آئی اور چلی کانپ گیا کیونکہ چچا کے علاوہ اور کوئی ایسا نظر نہیں آتا تھا، جو اُس سسرالی یتیم کے سر پر ہاتھ رکھ سکتا۔

"چچا خُدا سے ڈرو۔ آخر کس نے پھنسایا ہے مجھے اس جنجال میں۔"

"اب کیا قیامت ٹوٹی ہے . . . ؟"

چلی نے ایک ہی سانس میں پوری کہانی دُہرا دینے کی کوشش کر ڈالی۔

"ابے ٹھہر ٹھہر کر بول" دوسری طرف سے آواز آئی "سمجھنے بھی دے" اس پر چلی کی اتنی حوصلہ افزائی ہوئی کہ اس نے دلیپ کمار کے سے خوابناک انداز

میں بولنا شروع کر دیا۔

سب کچھ سننے کے بعد چچا نے قہقہہ لگایا تھا۔

"اب تم بھی مضحکہ اُڑاؤ گے" چلی ناک کے بل بولا۔

"نہیں بیٹے . . . سُپر ہٹ کہانی ہے۔ تو وہ لونڈیا نا ہید جی دار معلوم ہوتی ہے۔ اس گھرانے سے بھی میں واقف ہوں۔ تمہارے سسرال والوں سے زیادہ مالدار ہیں وہ لوگ۔"

"اچھا تو پھر۔"

"اگر وہ لڑکی ضد پر آگئی تو قصہ طول پکڑ لے گا۔"

"سوال تو یہ ہے کہ اس وقت میں کیا کروں۔"

"پندرہ دن تو سوشلسٹ ہی بن کر نکال لے جاؤ گے . . . . وہ لڑکی فاخرہ کیسی ہے۔"

"خاصے مردانہ انداز والی ہے . . ."

"مطلب یہ ہے کہ کسی حد تک تمہارا ساتھ دے سکے گی۔"

"او چچا کام کی بات کرو۔ لڑکیوں پر تکیہ نہیں کر سکتا۔"

"مالی پوزیشن کیا ہے تمہاری . . ."

"صرف چار روپے باسٹھ پیسے جیب میں پڑے ہوتے ہیں۔"

"انہیں بھی خیرات کر دے۔"

"کیا مطلب۔"

"دو چار فاقوں کے بغیر تجھے عقل نہیں آئے گی فرزند۔"

"کیا ابھی اور عقل آنی چاہیئے۔"

"جس فون پر بات کر رہا ہے اس کا نمبر نوٹ کرا دے . . . اگر

تھوڑی دیر بعد کچھ سوچ سکا تو مطلع کر دوں گا۔"

" تھوڑی دیر میں تو میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔"

" اگر جواب نہ ملا تو مجھے یقین آجائے گا کہ تم مر چکے ہو۔ بہر حال نمبر نوٹ کراؤ۔"

چلی نے حسب ہدایت اُس انسٹرومنٹ پر لکھے ہوئے نمبر چچا کو نوٹ کرائے تھے اور چچا نے دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا تھا۔

اب کیا کرے۔ وہ سر پر ہاتھ رکھ کر سوچنے لگا۔ پتہ نہیں اُس کے بعد ناہید پر کیا گزری ہو۔ کیوں نہ اُس سے بھی فون پر رابطہ قائم کیا جائے۔

نمبر ڈائیل کئے۔ کسی ملازم نے کال ریسیو کی تھی۔ چلی نے اپنا نام بتا کر ناہید سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

تھوڑی دیر بعد ناہید کی آواز آئی۔

" اوہ۔ ڈیئر۔ ۔ ۔ کہاں سے بول رہے ہو۔"

"کیا حال ہے تمہارا۔"

" مجھے یقین ہے کہ گھر پر نہیں ہو اس وقت۔"

" تم ٹھیک سمجھیں۔ مجھے میری مرضی کے خلاف کوئی ہلا بھی نہیں سکتا۔ میں نے شاہدہ کا منصوبہ ناکام بنا دیا۔ چلتی جیپ سے چھلانگ لگا دی تھی۔"

" کہیں چوٹ تو نہیں آئی میری جان۔" اس نے دردناک لہجے میں پوچھا اور چلی اس طرزِ تخاطب پر ریشہ خطمی ہو کر رہ گیا۔

" ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی۔" اُس نے کہا۔

" اب میں تم پر فخر کر سکوں گی۔ لیکن ہو کہاں۔"

" ایک دوست کے گھر سے بات کر رہا ہوں۔"

" میرے پاس آجاؤ۔ ۔ ۔ یہ اب محسوس کر رہی ہوں۔ جیسی میری اُجاڑ زندگی کو تمہارا ہی انتظار تھا۔"

" ذرا ایک آدھ دن اور انتظار کرو۔ شاہدہ کے ہاتھوں تمہاری توہین برداشت نہیں کر سکوں گا۔"

" ارے اُسے بھول جاؤ۔ اب تو ادھر کا رُخ کر کے دیکھے۔ زندہ واپس نہ جا سکے گی۔"

" میں سخت شرمندہ ہوں۔ میری وجہ سے ۔ ۔ ۔"

" ارے ختم بھی کرو۔ کیا رکھا ہے ان باتوں میں تمہارے لئے تو میں سارے زمانے سے ٹکرا سکتی ہوں میرے محبوب۔"

" اے اللہ رحم کر مجھ پر۔" اس نے دل میں کہا۔ پھر ماؤتھ پیس میں بولا۔

" ایسا ہی کچھ مجھے بھی محسوس ہو رہا ہے۔ تقدیر کے چکر نے شاہدہ کے جال میں پھنسا دیا۔ ورنہ میرے خوابوں کی تعبیر تو تم ہو۔"

" اب زیادہ نہ تڑپاؤ۔ آجاؤ۔" ناہید کراہی تھی۔

" آج نہیں۔ کل کسی وقت ۔ ۔ ۔"

" فون نمبر بتا دو مجھے۔"

" دیکھو میں نہیں چاہتا کہ۔ ۔ ۔ تم عالمِ اضطراب میں کوئی ایسی حرکت کر بیٹھو جو تمہارے وقار کے منافی ہو۔ لہٰذا میں ابھی فون نمبر بھی نہیں بتاؤں گا۔"

" دل توڑنے والی باتیں نہ کرو۔"

" تمہاری عزت مجھے تم سے بھی زیادہ عزیز ہے۔" کہہ کر چلی نے سلسلہ

منقطع کردیا۔ اس کے بعد کچھ دیر تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا تھا۔ فون سامنے
ہی تھا لہٰذا ہاتھ میں پھر کھجلی شروع ہوئی۔ اُس بار کوٹھی ہی کے نمبر ڈائیل کر ڈالے
اور اتفاق سے کال ریسیو کرنے والی شاہدہ ہی ثابت ہوئی۔

ماؤتھ پیس کو رومال سے ڈھانک کر بولا "میں بیگم شاہدہ چلّی پرویز سے ملنا
چاہتا ہوں۔ ۔ ۔"

"کون صاحب ہیں۔ میں شاہدہ ہی بول رہی ہوں"

"محترمہ آپ کے شوہر کی زندگی خطرے میں ہے"

"کتنی دیر کے لئے" شاہدہ کی آواز آئی۔

چلّی گڑبڑا گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے سانس رُک رہی ہو۔ جی کڑا کر کے
بولا "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا"

"میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ خطرے کی مُدت کتنی ہے"

"جب تک آپ دس ہزار روپے نہ فراہم کردیں"

"یعنی میرے شوہر کے عوض تم دس ہزار روپے چاہتے ہو"

"یہی بات ہے"

"اچھا اگر میں یہ رقم ادا کرنے سے انکار کردوں تو"

"ہم اُسے قتل کردیں گے"

"بہت بہت شکریہ۔ تم نے میری ایک بڑی مشکل آسان کردی۔ میں ایک
پیسہ بھی نہیں دے سکتی"

چلّی کا ذہن جھنجھنا اٹھا۔

"ہیلو" دوسری طرف سے شاہدہ کی آواز آئی۔

"ہیلو" چلّی کو اپنی آواز کسی اندھے کنویں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

"البتہ ۔ ۔ ۔ ایک کام کے عوض صرف دو ہزار روپے دے سکوں گی"

"کس کام کے عوض"

"اُس کی لاش آج ہی پولیس کے ہاتھ آجاتے"

چلّی نے بوکھلا کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ ٹھنڈا پسینہ سارے جسم سے چھوٹ
پڑا تھا۔

دونوں ہاتھوں سے کلیجہ تھامے بیٹھا رہا۔ ۔ ۔ خدا کی پناہ۔ یہ بیوی ہے
جو اس طرح بیوہ ہوجانے پر تُلی بیٹھی ہے۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی اور وہ اُچھل پڑا۔ شاید چچا کی کال ہے۔ اس نے
سوچا۔ کوئی عمدہ سی تدبیر سُوجھ گئی ہوگی۔

جھپٹ کر ریسیور اٹھایا اور ماؤتھ پیس میں بولا "ہیلو"

"خیریت اسی میں ہے کہ گھر واپس آجاؤ" دوسری طرف سے شاہدہ
کی آواز آئی۔

"یعنی کہ۔ یعنی کہ۔ ۔ ۔" چلّی ہکلا کر رہ گیا۔

"یعنی کہ اُن تینوں میں سے ایک سوشلسٹ نہیں تھی" شاہدہ کی
آواز آئی۔

"خدا غارت کرے ان لڑکیوں کو" چلّی روہانسا ہوکر بولا "خود ہی
بھکایا مجھے اور خود ہی جاکر جَڑ بھی دیا۔"

"بکواس بند کرو اور چپ چاپ گھر چلے آؤ"

"کیا یہ مکان کھُلا چھوڑ دوں ۔ ۔ ۔ چابی فاخرہ ہی کے پاس ہے"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ اگر ایک گھنٹے کے اندر اندر گھر نہ پہنچے تو پھر دیکھنا
اپنا حشر"

" فاخرہ سے کہو کہ مکان سنبھالے میں چلا آؤں گا "

" میں نہیں جانتی کہ فاخرہ اس وقت کہاں ہے "

" تو پھر میں کیا کروں "

" میں نہیں جانتی "

" اچھا۔ اچھا۔ کچھ کرتا ہوں ۔ ۔ ۔ یقین جانو کہ انہی تینوں نے مجھے یہ پٹی پڑھائی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ میں کتنا بیوقوف ہوں "

" اچھی طرح جانتی ہوں " شاہدہ کی آواز آئی اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

" خداوندا ۔ ۔ ۔ اب کیا کروں " چنّی نے کہا اور ریسیور کریڈل پر رکھ کر دونوں ہاتھوں سے سر پیٹنے لگا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرنا چاہیے ۔ شاہدہ کے ہاتھ لگا تو دُرگت ہی بن جائے گی۔ خدا غارت کرے اس لڑکی کو جس نے شاہدہ کو اصل واقعے سے آگاہ کر دیا۔ بیچاری فاخرہ نے تو اپنی دانست میں ہمدردی ہی کی تھی۔

آخر شاہدہ کیا کرے گی۔ اگر ایک گھنٹے کے اندر ہی اندر گھر نہ پہنچا، پہلے ہی کیا کم بے عزتی ہوتی تھی۔

اور پھر اس نے آخر کار چچا کو گالیاں دینی شروع کر دی تھیں ۔ اگر وہ مردود اس کی داڑھی کے پیچھے نہ پڑتا تو مزے میں زندگی گزر رہی ہوتی۔ نہ باپ خرچ بند کرتا اور نہ وہ پوری طرح چچا کے پھندے میں پھنس جاتا۔ اپنا انتقام لینے کے لئے خواہ مخواہ اس کی گردن کٹوا دی تھی مردود نے۔

چچا کی شان میں پڑھا جانے والا قصیدہ ابھی اختتام کو نہیں پہنچا تھا کہ

کسی نے باہر سے گھنٹی بجائی۔

بوکھلا کر صدر دروازے کی طرف دوڑا۔ دروازہ کھولا تو فاخرہ دکھائی دی۔ جو ٹفن کیریئر ہاتھ میں لٹکائے کھڑی تھی۔ مسکرا کر بولی " تمہارے لئے کھانا لائی ہوں ۔ ۔ ۔ "

" ارے بھاگو جلدی یہاں سے ۔ ۔ ۔ " چنّی ہانپتا ہوا بولا " گھپلا ہو گیا "

" کیا کہہ رہے ہو "

" ہاں ہاں ۔ ۔ ۔ شاہدہ کی کال آئی تھی "

" ناممکن "

" خدا کی قسم۔ کہہ رہی تھی کہ اُن تینوں میں سے ایک سوشلسٹ نہیں تھی "

" فرزانہ کی بچّی ہو گی " فاخرہ دانت پیس کر بولی " خیر آنے دو " اُسے ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیا تو ۔ ۔ ۔ "

" بات بڑھانے سے کیا فائدہ ۔ ۔ ۔ " چنّی نے جلدی سے کہا۔

" اچھا " وہ آنکھیں نکال کر بولی " تم ہی بزدلی دکھاؤ گے تو کیسے کام چلے گا "

" بزدلی کی بات نہیں جگ ہنسائی سے ڈرتا ہوں "

" اچھی بات ہے تو دفع ہو جاؤ یہاں سے "

" یہی زیادہ مناسب رہے گا "

" ذلت کی زندگی تمہارا مقدر ہے۔ کوئی کچھ نہیں کر سکتا " فاخرہ پُرتنفر لہجے میں بولی تھی۔

"بات سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"میں کہتی ہوں نکل جاؤ یہاں سے ورنہ میرے ہی ہاتھوں سے قتل ہو جاؤ گے۔"

چلّی سرپٹ کی چال سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تک نہیں۔ کچھ دور تیز تیز چلنے کے بعد اُسے خیال آیا تھا کہ آخر وہ جا کہاں رہا ہے۔

کہاں جائے۔ کہاں ٹھکانا ہے۔ . . . ناہید۔ نہیں۔ . . . اگر وہ شاہدہ ادھر آئی اور اُسے یہاں نہ پاکر پھر ناہید کی طرف رُخ کیا تو اس بار واقعی بے عزتی ہو جائے گی اِسٹوڈیو میں جو کچھ بھی ہوا تھا۔ اُس کا علم شاید ناہید کے خاندان کے دوسرے افراد کو نہ ہو سکا تھا۔ لیکن اب اگر کوئی ایسی واردات ہوئی تو ضروری نہیں کہ چند افراد تک محدود رہ جاتے . . .

عجیب سی بدحواسی اُس پر طاری ہو گئی تھی۔ اُجالے میں ہانک دی جانے والی چمگادڑ کی طرح بھٹکتا پھر رہا تھا۔ اور پھر اچانک اُسے رُک جانا پڑا۔ چچا اسکوٹر پر سوار اُسی طرف چلا آ رہا تھا اور اس کی نظر بھی شاید چلّی پر پڑ گئی تھی۔

وہ اس کے قریب ہی آ رُکا۔

"بیٹھ جا پیچھے"۔ وہ خونخوار لہجے میں بولا تھا۔

ڈوبتے کو تنکے کا نہیں بلکہ شہتیر کا سہارا مل گیا۔ ایک ہی چھلانگ چلّی کو کیریئر پر لے گئی تھی اور اسکوٹر چل پڑا۔

"میرے پہنچنے سے پہلے ہی کہاں بھاگ کھڑے ہوئے تھے برخوردار"۔ چچا نے سوال کیا۔

"تو تم نے فون نمبر سے مکان کا بھی پتا لگا لیا تھا"

"ذرا دیر کی بات تھی"

"دراصل کھیل بگڑ گیا . . ." چلّی نے دل گرفتگی کے ساتھ کہا۔

"کیا کھیل"

"کہیں اطمینان سے بیٹھو تو بتاؤں۔ اسکوٹر کے شور میں حلق نہیں پھاڑ سکتا"

چچا کچھ نہ بولا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے ایک کیفے کے سامنے اسکوٹر روکا تھا۔ کیفے کے اندر پہنچ کر چچا نے ایک گوشے کی خالی میز منتخب کی تھی اور اطمینان سے بیٹھ کر چلّی کی روداد کی دوسری قسط سننے لگا تھا۔

ویسے چلّی نے شروع سے محسوس کر لیا تھا کہ چچا کو پہلے کبھی ایسے موڈ میں نہیں دیکھا تھا۔

بہرحال اُس کی کہانی کا بقیہ حصّہ سن لینے کے بعد اس نے گہری سانس لی تھی اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا "بٹیا تم ایک زبردست مشکل میں پڑ گئے ہو"

"وہ تو ظاہر ہے"

"کیا ظاہر ہے"

"گھر گیا تو مجھے بند کر دے گی"

"ابے کیوں دماغ خراب کر رہا ہے اس کی کیا حیثیت ہے۔ اس کی بات ہوتی تو میں اسی طرح دوڑ آتا؟"

"پھر کیا بات ہے"

"تم ابھی ابھی جس عمارت سے نکل کر آئے ہو۔ وہ پولیس کی نگرانی میں ہے۔ عنقریب تالا توڑ کر اُس کی تلاشی لی جائے گی"

"کیوں؟" چلّی اچھل پڑا۔

"لمبی کہانی ہے۔" بہرحال جیسے ہی مجھے ایکس چینج سے معلوم ہوا کہ وہ کس کے فون نمبر ہیں اور کس عمارت سے وہ فون تعلق رکھتا ہے نکل کھڑا ہوا کہ کسی طرح تمہیں اس عمارت سے نکال لوں۔"

"بات کیا ہے چچا جلدی سے بتاؤ۔"

"کیا نام بتایا تھا لڑکی کا۔"

"سعیدہ۔ فاخرہ کی سہیلی ہے۔ گُجّو، فاخرہ کے پاس ہے۔"

"تو اس فاخرہ کی بھی خیریت نہیں۔"

"اُف فوہ اصل بات تو بتاتے نہیں۔"

"سعیدہ کا باپ جعلی نوٹوں کا کاروبار کرتا تھا جیسے ہی اُسے معلوم ہوا کہ سی آئی ڈی والے اس میں دلچسپی لے رہے ہیں اپنے افرادِ خاندان سمیت فرار ہوگیا۔ ملنے جلنے والوں پر یہ ظاہر کیا تھا کہ تبدیلیٔ آب و ہوا کی خاطر باہر جا رہے ہیں۔"

"تو پھر اس سے کیا ہوتا۔ میرے لئے کون سی مشکل پیدا ہوگئی ہے۔"

"تم نے اپنی انگلیوں کے بے شمار نشانات وہاں چھوڑے ہوں گے۔"

"ارے باپ رے۔" چلّی پیٹ پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

"ایک بار بھی ہتھکڑی پڑ گئی تو . . . . ہمیشہ کے لئے عزت گئی برخوردار . . . یہ تو عدالت میں ثابت کیا جاسکے گا کہ تمہارا تعلق اس عمارت سے نہیں تھا۔ مکان کی نگرانی کرنے والوں نے تمہاری شکل دیکھی ہوگی اور اب تک پتہ بھی لگا لیا ہوگا کہ تم کون ہو۔"

"اچھا تو پھر۔"

"مکان کے اندر پائے جانے والے انگلیوں کے نشانات تمہاری انگلیوں کے نشانات ملائے جائیں گے۔ اس وقت فون ہی پر تم نے اپنی انگلیوں نشانات چھوڑے ہوں گے۔ بہرحال اسی بنا پر وہ تمہیں دھرلیں گے اور پوچھیں گے کہ سعیدہ کا باپ کہاں گیا ہے۔ ظاہر ہے تم کیا بتاؤ گے۔ تم نے تو آج تک اس کی شکل بھی نہ دیکھی ہوگی۔"

"ظاہر ہے۔" چلّی کی سانس پھولنے لگی۔

"پھر وہ عدالت سے تمہارا ریمانڈ لیں گے۔ کم از کم ایک ہفتے کے لئے۔ یعنی ایک ہفتے تک تمہاری اس قدر ٹھکائی ہوگی کہ تم بوکھلا کر سعیدہ کے باپ کو نہ صرف اپنا خالو تسلیم کرلو گے بلکہ ننہال کا پتہ بھی بتا دو گے۔"

"لل۔ لیکن وہ میرا خالو نہیں ہے۔"

"پولیس والے چاہیں تو کسی کتے کے پلے کو بھی تمہارا خالو بنا سکتے ہیں۔"

"دل دہلانے والی باتیں نہ کرو چچا۔"

"میں وہی کہہ رہا ہوں جو ہونے والا ہے۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہوا تم بھی مجھے اس مصیبت سے نجات نہیں دلا سکتے۔"

"ابے کیوں بچّوں کی سی باتیں کرتا ہے۔ کیا اپنی شادی کے موقع پر میری پاور نہیں دیکھ چکا ہے۔"

"وو . . . دیکھی . . . تھی۔ بہت بڑے بڑے افسر شریک تھے۔"

"بس تو پھر میں تجھے بچا سکتا ہوں۔"

"بچا لو . . . چچا خدا کے لئے۔ ورنہ میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گا۔"

"اس شرط پر کہ تم پولیس والوں کے ہاتھ نہ آؤ۔ کم از کم ایک ہفتے تک...
اس کے بعد تو پھر وہ تمہارا نام تک نہ لیں گے۔"

"کس طرح ہاتھ نہ آؤں۔"

"فکر نہ کرو۔ ۔ ۔ تمہارے فرار کے انتظامات کر لینے کے بعد ہی تمہاری تلاش میں نکلا تھا۔ بقیہ انتظامات بھی جلد ہی ہو جائیں گے۔"

"تت تو پھر میں گھر واپس نہ جاؤں۔"

"واپس جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔"

"اچھا تو پھر۔"

"میرے ساتھ چلو۔"

"اس وقت تم چچا نہیں بلکہ باپ دادا سب کچھ معلوم ہو رہے ہو۔"

"صرف چچا۔ ۔ ۔" وہ نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر بولا۔

کافی کا ایک ایک کپ پی کر وہ کیفے سے اُٹھ گئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد چلی نے خود کو ایک ہوٹل کے کمرے میں پایا۔ چچا اُسے وہاں چھوڑ کر کہیں چلا گیا تھا اور تقریباً دو گھنٹے کے بعد اس کی واپسی ہوئی تھی۔

"یہ رہا تمہارا سوٹ کیس۔ ۔ ۔ اس میں تمہارے کپڑے بھی ہیں۔" اس نے کہا۔

"کک۔ ۔ ۔ کپڑے۔ تو کیا گھر سے منگوائے ہیں۔" چلی نے بوکھلا کر پوچھا۔

"کیوں قدیم چلیوں کی سی باتیں کرتا ہے۔" چچا بھنّا کر بولا "گھر والوں کو اطلاع دینی ہوتی تو تجھے ہی کیوں نہ وہیں بھجوا دیتا۔"

"تو پھر؟"

"تیری ناپ کا ایک ریڈی میڈ سوٹ اور دو قمیضیں خریدی ہیں۔"

"ہائے تمہارے احسانات۔"

"بس بس زیادہ بکواس نہیں۔ آج چار بجے کی فلائیٹ سے تم راجگڑھ جا رہے ہو۔"

"فف۔ ۔ ۔ فلائیٹ۔" چلی پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

"اب کیا ہوا۔"

"ارے باپ رے۔"

"پہلے کبھی نہیں کیا فضائی سفر؟"

"لوٹھک لوٹا میں ایئرپورٹ نہیں ہے۔"

"خیر۔ ۔ ۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ تمہیں نہیں اُڑنا پڑے گا۔ ۔ ۔ جہاز اُڑے گا۔"

"کیسا لگتا ہوگا۔"

"دیکھ لینا۔ ۔ ۔"

"ٹرین سے کیوں نہیں بھیج دیتے۔"

"ابے بکواس کئے جا رہا ہے خواہ مخواہ۔ ۔ ۔ ٹکٹ خرید چکا ہوں۔ اتنی جلدی کا ریزرویشن کہاں ملتا ہے۔ ۔ ۔ تم عطاء اللہ کے نام سے سفر کرو گے۔"

"یہ تو فراڈ ہوا۔"

"تمہیں سفر کرنا ہے عطاء اللہ کے نام سے۔ ایئر ہوسٹس سے شادی نہیں کرنی۔ عطاء اللہ ہی سے خریدا ہے ٹکٹ۔ ۔ ۔ اتنا وقت نہیں ہے کہ اس کا

ریزرویشن کینسل کرکے ٹکٹ تمہارے نام منتقل کرایا جائے اور پھر کون تم سے نام پوچھے گا۔ وہ تو صرف کاغذات کے لئے ہے۔"

"اللہ مالک ہے۔"

"راجگڑھ ایئر پورٹ سے ایڈیلفی ہوٹل جانا۔ وہاں کے کمرہ نمبر بائیس میں میرا ایک دوست شہباز خان مقیم ہے۔ اسی کے ساتھ تمہارا قیام ہوگا۔ میں نے اسے تار دے دیا ہے۔"

"تو وہ مجھے ریسیو کرنے آئے گا۔"

"لاٹ صاحب کے بچے ہو ناکہ ریسیو کرنے آئے گا۔۔۔ ابے ہوش میں رہ چلے۔ تجھے جانا پڑے گا ایڈیلفی ہوٹل اور شہباز خان سے بتانا پڑے گا کہ تم عطاء اللہ ہو۔"

"اسے بھی غلط نام بتاؤں گا۔"

"اصل نام بتاؤ گے تو زحمت میں پڑ دگے۔ پورے ملک میں صرف ایک چلی خاندان پایا جاتا ہے اور وہ لوٹک لوٹا میں آباد ہے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" چلی خوش ہوکر بولا۔ "ہم لوگ بہت مشہور ہیں۔"

"اسی لئے۔۔ عطاء اللہ۔"

"بالکل سمجھ گیا۔ اب کوئی پرواہ نہیں۔"

"آج گیارہ تاریخ ہے۔ تم آج ہی ساڑھے آٹھ بجے شب کو راجگڑھ پہنچ جاؤ گے۔۔۔ ایک ہفتے قیام کرکے اٹھارہ تاریخ کو ٹرین سے واپس آجانا اس کے لئے تمہیں پہلے سے ریزرویشن کرانا پڑے گا لہٰذا سب سے پہلا کام یہ کرنا کہ ریلوے اسٹیشن جاکر اٹھارہ تاریخ کے لئے سپر ایکسپریس میں سیٹ کا ریزرویشن کرا لینا۔ اپر کلاس ٹیٹ سنڈ میں۔"

"ارے فضول خرچی کی کیا ضرورت ہے تھرڈ کلاس میں سفر کرلوں گا۔"

"تم وہی کروگے جو میں کہوں گا۔ خرچ میرا ہو رہا ہے یا تمہارا۔"

"میرا دل چاہتا ہے کہ چچا کہ تمہارے قدموں پر سر رکھ دوں اور میرا دم نکل جائے۔"

"ایک ہفتے تک جی بھر کے سیر و تفریح کرنا۔ شہباز خان سے اپنے بارے میں کسی قسم کی بھی گفتگو مت کرنا۔ صرف اس کی باتوں کے جواب دیتے رہنا خود اس سے کوئی سوال نہ کرنا۔"

"ایسا ہی ہوگا۔

"یہ رکھو مزید ایک ہزار روپے۔۔۔ واپسی کے سفر اور دوسرے اخراجات کے لئے۔"

"شاید میرا والدِ حقیقی بھی میرے لئے اتنا نہ کرسکتا۔"

"ابے تو کیا مجھے سوتیلا سمجھتا ہے۔"

"ارے۔۔ تم تو سگوں سے بھی بڑھ کر۔ انکل ڈارلنگ۔"

"زیادہ مکھن نہیں۔" چچا ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "کھانا کھا چکے یا نہیں۔"

"ابھی کہاں نصیب ہوا ہے۔"

"ابے تو روم سروس کو رنگ کرکے کیوں نہیں منگوا لیا تھا۔"

"میں نے سوچا تم سے پوچھے بغیر۔۔۔"

"خیر۔۔ خیر۔۔۔ میں منگواتا ہوں ابھی میں نے بھی لنچ نہیں کیا۔"

- - - - - -

لئے سوہان روح بنا رہتا تھا اس لئے یہاں بھی عادتاً اس نے اسی طرف توجہ دی تھی

بہرحال ٹیکسی کے ذریعے ایڈیلفی ہوٹل پہنچا اور کمرہ نمبر بائیس کا دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔

"کون ہے؟" اندر سے بھاری بھرکم آواز آئی۔

"جی۔ میں ہوں۔ . . عطاءاللہ۔ . . " چلی نے بدقت کہا تھا۔

دروازہ کھلا تھا اور ایک خوفناک قسم کا چہرہ نظر آیا تھا۔ سُرخ سُرخ آنکھوں اور چڑھی ہوئی مونچھوں والا چہرہ۔

چچا کا تار ملتے ہی اُس کے دوست شہباز نے یہ سب کچھ کیا ہوگا۔

لیکن یہ شہباز صرف اپنے کام سے کام رکھنے والا ثابت ہوا۔ زبان ہی بند کرلی تھی اپنی اور یہ بھول گیا تھا کہ کمرے میں کوئی اور بھی موجود ہے۔

چلّی شدت سے بور ہوتا رہا۔ بہت دیر بعد شہباز خان نے اس سے کہا تھا" بھوک لگے تو نیچے جاکر میرے حساب میں کھا لینا۔ میں نے کاؤنٹر پر ہدایت کردی ہے۔"

جوں توں کر کے چلّی نے رات گزاری تھی اور صبح ہی سیٹ ریزرو کرانے کے لئے ریلوے اسٹیشن کی طرف بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

وہاں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی۔ بہ آسانی ریزرویشن ہوگیا تھا۔ اس کے بعد وہ فوراً ہی ہوٹل واپس نہیں چلا آیا تھا۔ راجگڑھ کی مخمورکن فضاؤں سے لطف اندوز ہوتا پھرا تھا۔ بڑی خوبصورت جگہ تھی چاروں طرف سرسبز پہاڑ بکھرے ہوئے تھے۔ پھر دوپہر کے کھانے سے قبل واپسی نہیں ہوئی تھی۔ کمرے کی طرف جا ہی رہا تھا کہ کاؤنٹر کلرک نے اشارے سے روک لیا۔

"فرمائیے؟"

"کمرے کی کنجی۔ ۔ ۔" کلرک نے کنجی اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "شہباز خان چلے گئے ہیں اور آپ کے لئے کمرے کے کرائے کی پیشگی ادائیگی بھی کر گئے ہیں۔"

"کب تک کے لئے" چلّی نے پریشان ہوکر پوچھا۔

"ایک ہفتے کے لئے جناب اور معذرت کر گئے ہیں کہ گھر سے بیوی کی علالت کا تار آیا تھا اس لئے آپ سے ملے بغیر جانا پڑا۔"

چلّی نے کنجی سنبھالی تھی اور کمرے میں پہنچا تھا اور پھر اُسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ اس کا سوٹ کیس نا تھا۔ پانچ سو روپے تو وہ سوٹ کیس ہی میں چھوڑ گیا تھا۔ اب کیا ہوگا اور شہباز کے بچے۔ ۔ ۔ بلکہ چچا کے بچے۔ ۔ ۔ اب پتہ نہیں کس مصیبت میں پھنسانے والا ہے۔ ۔ ۔

پھر اس کا سر چکرایا تھا۔ ۔ ۔ اور وہ دھم سے بستر پر گر کر بیہوش ہو جانے کی کوشش کرنے لگا تھا۔

بیہوش ہوجانے کی کوشش میں ناکامی کے بعد چلّی پھر اُٹھ بیٹھا۔ ۔ ۔ سوچ رہا تھا کہ بیہوش ہوجانے سے کیا فائدہ اس سے بہتر تو یہ ہوگا کہ دونوں جوتے آتارے اور اُن سے سر پیٹنا شروع کردے۔ آخر وہ بقیہ پانچ سو روپے سوٹ کیس ہی میں کیوں چھوڑ گیا تھا۔ چچا نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ شہباز خان پر اس حد تک اعتماد کرلینا۔ ۔ ۔ اب اس کی جیب میں باقی ہی کیا بچا تھا۔ اے سی سی میں سیٹ ریزرو کرالینے کے بعد کل رقم مبلغ ایک سو اٹھائیس روپے رہ گئے تھے۔

اب کیا ہوگا۔ ایک ہفتہ کس طرح گزرے گا۔ کاؤنٹر کلرک کے بیان کے مطابق شہباز خان نے صرف رہائش کرائے کی پیشگی ادائیگی کردی تھی۔ کھانے اور ناشتے کے اخراجات کا کیا ہوگا۔ ۔ ۔ الجھن بڑھتی رہی اور پھر اُسے باتھ روم کی راہ لینی پڑی تھی۔ لیکن دروازہ کھولتے ہی ٹھٹھک گیا شہباز خان کا سوٹ کیس سامنے رکھا ہوا نظر آیا۔ ۔ ۔ جھپٹ کر اس کا ڈھکنا اٹھایا تھا۔

"واہ ـــ بھئی۔ ۔ ۔ خوب۔ ۔ ۔" اس کی زبان سے بے ساختہ

نکلا۔۔۔ کپڑے اور دوسرا سامان اُس لفافے سمیت جس میں مبلغ پانچسو کے نوٹ چھوڑ گیا تھا۔ شہباز خان کے سوٹ کیس میں موجود تھا۔ "واہ پیارے"۔ دوسری چیکار نکلی۔۔۔ میرا سوٹ کیس اتنا ہی پسند آیا تھا تو مانگ لیا ہوتا۔۔۔ اس طرح لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔"

ایک تنکا بھی تو غائب نہیں ہوا تھا۔ چلّی نے ایک بار پھر خوشی کا نعرہ لگایا۔۔۔ باتھ روم کے استعمال کی ضرورت اب باقی نہیں رہی تھی۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی اور وہ اچھل پڑا۔ تیزی سے انسٹرومنٹ کی طرف آیا تھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھ سے ریسیور اٹھایا۔

دوسری طرف سے نسوانی آواز آئی تھی۔ "کیا عطاء اللہ صاحب ہیں۔" ساری رانگ نمبر کہنے ہی والا تھا کہ اچانک یاد آیا عطاء اللہ ہی کے نام سے تو ہوائی جہاز میں سفر کیا تھا۔۔۔

"جج۔۔۔ جی۔۔۔ ہاں۔۔۔ فرمائیے۔۔۔" وہ ماؤتھ پیس میں ہکلایا۔

"کیا آپ زینت میڈیکل سٹور تک تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائیں گے۔"

"زینت میڈیکل سٹور" چلّی نے یادداشت پر زور دیتے ہوئے دُہرایا۔

"جی ہاں چوراہے پر۔۔۔ داہنی جانب۔۔۔"

"ل۔۔۔ لیکن آپ کون ہیں۔"

"میں نے سیاہ جیکٹ اور نیلی جین پہن رکھی ہے۔ بال سنہرے ہیں۔ آپ کو پہچاننے میں دشواری نہ ہوگی۔ فوراً آجائیے۔"

"جی بہت اچھا۔" چلّی نے کہا اور ریسیور رکھتا ہوا بڑبڑایا۔ "آواز تو بڑی سُریلی ہے۔۔۔ عمر بھی بتادی ہوتی۔"

بھاگم بھاگ چوراہے پر آیا تھا۔ سامنے ہی زینت میڈیکل اسٹور کا بڑا سا بورڈ نظر آیا اور آنکھوں میں نیلی پیلی دھاریاں چکرانے لگیں۔

یاد نہیں کہ کس طرح اُس نے سڑک پار کی تھی۔ کاؤنٹر کے قریب وہ کھڑی دکھائی دی۔ سیاہ جیکٹ اور نیلی جین میں پیاری لگ رہی تھی۔ عمر زیادہ سے زیادہ چوبیس سال رہی ہوگی۔ بال سنہرے تھے اور سُرخ و سفید چہرے پر زندگی سے بھرپور آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔

"عطاء اللہ" وہ اُس کے قریب ہوکر آہستہ سے بولا۔

"وہ ہنس پڑی اور بولی۔" نام سے تو میں سمجھی تھی کوئی باریش بزرگ ہوں گے مگر آپ تو ــــ"

"فف فرمائیے۔۔۔ کیا خدمت کرسکتا ہوں۔"

"فی الحال اپنی جان بچانے کی فکر کیجئے میری خدمت پھر کبھی کردیجئے گا۔"

"جی میں نہیں سمجھا۔"

"میرے ساتھ آئیے۔۔۔" وہ دروازے کی طرف بڑھتی ہوئی بولی۔ دونوں فٹ پاتھ پر اُتر آئے اور لڑکی نے کہا۔ "رئیس صاحب نے اطلاع دی ہے کہ آپ خطرے میں ہیں اس لئے فوراً ہوٹل چھوڑ دیجئے۔"

"خدا کی پناہ۔۔۔ لیکن جاؤں کہاں۔۔۔"

"میرے ساتھ چلئے۔"

"لل۔۔۔ لیکن۔۔۔"

”جلدی کیجئے! وقت کم ہے۔“

”سامان تو لے آؤں۔ ۔ ۔“

”صرف کاغذات اگر کسی قسم کے ہوں، سامان جہاں ہے وہیں پڑا رہنے دیجئے۔“

”مطلب یہ کہ کپڑے وغیرہ۔“

”بہت مل جائیں گے ان کی فکر نہ کیجئے۔“

”اچھا تو کاغذات لے آؤں۔“ چلّی نے کہا۔

”جتنی جلدی ممکن ہو، میں یہیں کھڑی ہوں۔“

کاغذات میں نوٹوں کے لفافے اور رجسٹریشن کی رسید کے علاوہ اور کیا تھا۔ ۔ ۔ سرپٹ کی چال سے ایڈلفی پہنچا۔ مطلوبہ چیزیں لیں اور کنجی کاؤنٹر کلرک کے حوالے کر کے۔ ۔ ۔ پھر لڑکی کے پاس آ پہنچا۔

”لے آئے سب کچھ۔ ۔ ۔“

”جی ہاں۔“

لڑکی نے سُرخ رنگ کی ایک اسپورٹ کار کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”ڈرائیو کرو گے؟“

”زیادہ اچھی ڈرائیونگ نہیں۔“

”چلو میں خود ہی کر دوں گی۔ میں نے سوچا کہیں تم اسے مردانہ وقار کے منافی نہ سمجھو۔“

”اجی ہرگز نہیں۔“ چلّی نے کان پکڑتے ہوئے کہا۔ ”آپ لوگوں سے ہمیشہ ہار مان لیتا ہوں۔ یہ تو صدیوں سے ایک ہٹ دھرمی چلی آرہی ہے ورنہ مرد عورت سے برتر نہیں ہے۔“

”بہت پیارے شوہر ثابت ہو سکتے ہو۔“ وہ اُسے آنکھ مار کر مسکرائی تھی اور چلّی قدرے مضطرب ہو گیا۔ اُس کا یہ چچا بھی سالا عجیب چیز ہے۔ پتہ نہیں یہ محترمہ کون ہیں اور اس قدر بے تکلف کیوں ہو رہی ہیں۔

اسپورٹ کار میں بیٹھ گیا تھا اور لڑکی نے اسٹیرنگ سنبھالا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں چلّی کا دل حلق میں دھڑکنے لگا تھا۔ ۔ ۔ اسٹارٹنگ ہی طوفانی تھی۔ ۔ ۔ بالکل ایسا ہی معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی راکٹ لانچنگ پیڈ سے علیحدہ ہوا ہو۔ ۔ ۔

”تم نے ابھی تک میرا نام معلوم کرنے کی زحمت نہیں گوارا کی۔“ لڑکی نے کچھ دیر بعد کہا۔

”اوہ۔ جی ہاں۔ ۔ ۔ معافی چاہتا ہوں۔ ۔ ۔ دراصل۔ ۔ ۔“

”میرا نام سونیا ہے۔ ۔ ۔ لیکن تمہارا نام عطاءاللہ کچھ پسند نہیں آیا۔ بالکل عام سا ہے۔ ۔ ۔ ایسے ہی جیسے آدمی۔ ۔ ۔ میں بھی تو عطاءاللہ ہی ہوں۔ ۔ ۔ اللہ نے مجھے میرے والدین کو عطا فرمایا تھا۔“

چلّی نے زبردستی قہقہہ لگایا کیونکہ گاڑی کی رفتار اُسے دہلائے دے رہی تھی۔

”اگر میں عطاءاللہ کو ایٹولا کر دوں تو کیسی رہے گی۔“ لڑکی بولی۔

”جو دل چاہے کر دیجئے۔ آپ بیحد دلچسپ معلوم ہوتی ہیں۔“

”اتنی دلچسپ نہیں تھی جتنی تمہیں دیکھ کر ہو گئی ہوں۔ ۔ ۔“

”میں نہیں سمجھا۔ ۔ ۔“

”بہت خوبصورت ہو۔ دیکھ کر خوامخواہ چھیڑنے کو دل چاہتا ہے۔“

چلّی نے شرما کر سر جھکا لیا۔ لیکن اس کی نظر تو ونڈ اسکرین پر تھی، اس

لئے اس منظر سے لطف اندوز نہ ہو سکی۔ ۔ ۔

"کچھ بولتے رہو" اُس نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

"گگ ۔۔ کیا بولتا رہوں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ اچھا یہی بتا دیجئے کہ آپ مجھے کہاں لے جا رہی ہیں"

"اس سے پہلے میں درخواست کروں گی کہ آپ اور جناب کا تکلف ختم کر دو۔ ۔ ۔ تم کہہ کر مخاطب کرو"

"شکریہ"

"شکریئے کی بھی ضرورت نہیں۔ ہم بے تکلف دوست ہیں"

"اچھا۔ ۔ ۔ اچھا۔ ۔ ۔ تو تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو"

"اُفق کے اُس پار جہاں میرے اور تمہارے علاوہ کوئی نہ ہو"

چلی احمقانہ انداز میں ہنسا تھا۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں"

"بڑی عجیب بات ہے۔ ہماری ملاقات کو دیر ہی کتنی ہوئی ہے"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے تمہیں دیکھا اور عاشق ہو گئی۔ ۔ ۔ جب عاشق ہی ہونا ہے تو پھر دیر کیوں لگائی جائے"

"آپ واقعی دلچسپ خاتون ہیں"

"پھر وہی آپ"

"سوری۔ ۔ ۔ مطلب یہ کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے"

"کچھ بھی نہیں۔ ضروری نہیں کہ تم بھی کچھ کرو۔ ۔ ۔ مجھے ہونا تھا سو ہو گئی۔ ۔ ۔"

دفعتہً چلی نے سوچا کہیں کسی پاگل کے ہتھے تو نہیں چڑھ گیا۔ لیکن وہ

اُسے چچا کے حوالے سے اپنے ساتھ لائی تھی۔ ۔ ۔

"تم چچا کو کب سے جانتی ہو" چلی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"کس چچا کی بات کر رہے ہو۔ میرے کوئی چچا وچا نہیں ہے۔ ۔ ۔"

"مطلب یہ کہ رئیس صاحب"

"میں نہیں جانتی وہ کون ہیں۔ بس مجھے پیغام ملا تھا کہ تم خطرے میں ہو۔ لہٰذا تمہیں غائب کر دیا جائے"

"شہباز خان کو جانتی ہو"

"یہ نام میرے لئے بالکل نیا ہے"

چلی نے سوچا کہ اُسے سوٹ کیس والی بات بتا دے لیکن پھر ٹال گیا کیا فائدہ، جب اُسے جانتی ہی نہیں۔ ۔ ۔ اور اب تو اُسے اپنا سامان بھی ہوٹل ہی میں چھوڑ دینا پڑا تھا۔

"تم مجھے کس طرح غائب کرو گی" چلی نے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"دل میں چھپا لوں گی"

چلی پھر ہنسا تھا۔

"آخر تمہیں اتنی ہنسی کیوں آ رہی ہے؟"

"اظہارِ مسرت کے لئے" چلی نے سنبھالا لے کر کہا۔

"گویا تمہیں اس پر خوشی ہے کہ میں تم پر عاشق ہو گئی ہوں"

"اس پر تو بالکل خوشی نہیں ہوتی" چلی بھی چہکنے کے موڈ میں آ گیا تھا۔

"بدنصیب ہو" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی۔

"اس میں بدنصیبی کی کیا بات ہے۔ بس میں پسند نہیں کرتا کہ کوئی لڑکی مجھ پر عاشق ہو"

"بڑے عجیب ہو تم۔"

"عجیب نہیں بلکہ ڈرپوک ہوں اس معاملے میں۔"

"ڈرپوک خود عاشق نہیں ہوتا، لیکن اگر کوئی لڑکی اس پر عاشق ہو جائے تو پھولا نہیں سماتا۔"

"دل دہلانے والی باتیں نہ کرو۔"

"تمہارے سلسلے میں خاصی چھان بین کرنی پڑے گی۔"

"جو دل چاہے کرو لیکن اب عشق کا نام مت لینا۔"

"الرجک ہو . . ."

"اس حد تک کہ بسا اوقات کُتے کی طرح بھونکنے لگتا ہوں۔"

"تم بھی کم دلچسپ نہیں معلوم ہوتے۔"

"ٹھیک ہے بتاؤ کہ اب میرا کیا ہوگا؟"

"عیش کرو گے۔"

"میں نہیں سمجھا۔"

"آہستہ آہستہ سمجھو گے۔"

چلّی نے خاموشی اختیار کر لی . . . کار شہری آبادی سے نکل آئی تھی اور ایک گھنٹہ گزر جانے کے بعد بھی یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ اس سفر کا اختتام قریب ہو سکتا ہے۔

حدِ نظر تک سنگلاخ چٹانیں بکھری ہوئی تھیں . . . سبزہ کہیں نام کو بھی نہیں تھا۔ شہر سے نکلتے ہی منظر بدلا تھا۔ سبزے کی جگہ ننگی بھوری چٹانیں نظر آنے لگی تھیں۔

"ارے بھئی آخر کہاں لے جا رہی ہو . . ." چلّی کراہا تھا۔

"اُفق کے اُس پار . . . اس بیہودہ دُنیا سے دُور . . ."

"اور میں اتنا اُلو کا پٹھا ہوں کہ چلا جا رہا ہوں۔" چلّی جھنجھلا کر بولا۔

"میں اپنی زبان سے نہیں کہہ سکتی۔ تم کہتے ہو تو ٹھیک ہی ہوگا۔"

"کیا ٹھیک ہوگا۔"

"وہی جو تم کہہ رہے ہو۔"

"یعنی میں اُلو کا پٹھا ہوں۔"

"کچھ کچھ یقین ہو چلا ہے۔"

"براہِ کرم میری توہین نہ کرو۔"

"تمہاری جگہ اگر کوئی اُلو کا پٹھا نہ ہوتا تو اتنی دیر میں کئی بار گاڑی رُکوا چکا ہوتا۔"

"کیوں . . . ؟" چلّی آنکھیں نکال کر اس کی طرف مُڑا۔

"شیشی سے دودھ پینے کے لئے۔"

چلّی جل بھُن کر رہ گیا، لیکن کچھ بولا نہیں۔

"کیوں؟ چپ کیوں ہو گئے۔" اس نے تھوڑی دیر بعد پھر چھیڑا

"خاموشی ہی بہتر ہے۔"

"گولی مار کر کھڈ میں پھینک دوں گی۔"

"بہت زیادہ بے تکلفی کی اجازت نہیں دے سکتا۔ وقت نے ایک چکر میں ڈال دیا ہے تو کیا میں یہ بھول جاؤں گا کہ میں کون ہوں۔"

"تم کون ہو پیارے۔"

"اُلو کا پٹھا۔" چلّی آپے سے باہر ہو گیا۔

"وہ تو میں پہلے ہی تسلیم کر چکی ہوں . . . اور اسے تسلیم کئے بغیر

کسی کو بتا بھی نہیں سکتی کہ تم میرے شوہر ہو۔ ۔ ۔"

"کیا مطلب"؟ چلّی اچھل پڑا۔

"شوہر کا مطلب شوہر ہی ہوتا ہے خواہ وہ اُلّو کا پٹھا ہی کیوں نہ ہو۔"

"دیکھئے محترمہ۔ ۔ ۔ میں ۔"

"خاموش رہو۔ ۔ ۔ ہم یہ سفر شوہر اور بیوی کی حیثیت سے کر رہے ہیں۔"

"آخر کیوں؟"

"اس لئے کہ تم عطاءاللہ نہیں ہو۔"

"تمہاری کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ۔"

"خواہ مخواہ ذہن پر دباؤ مت ڈالو، جو کچھ کہوں اُس پر عمل کرتے رہو۔"

چلّی نے بے بسی سے طویل سانس لی تھی اور خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا تھا۔"مجھے بہت شدت سے پیاس لگ رہی ہے ۔"

"کچھ دیر بعد پانی مل سکے گا۔"

"میرے لئے کس قسم کا خطرہ تھا۔" اچانک چلّی نے سوال کیا۔

"میں نہیں جانتی مجھے جو پیغام ملا تھا تم تک پہنچا دیا۔"

"پیغام کے ساتھ میرے سلسلے میں کچھ ہدایات بھی ملی ہوں گی۔"

"ظاہر ہے ورنہ تمہیں اس طرح کیوں اٹھاتے پھرتی ۔"

"کیا ہدایات ملی تھیں ۔"

"عطاءاللہ سے فوراً شادی کر لو۔"

"کیوں مذاق کر رہی ہو؟"

"میں سنجیدہ ہوں ۔" وہ غصیلے لہجے میں بولی۔

"کیسے یقین کر لوں جب کہ ہدایت دینے والے کو میرے شادی شدہ ہونے کا علم ہے ۔"

"مجھے اس سے سروکار نہیں ۔"

"کیا مطلب؟"

"دس شادیاں بھی ہو چکی ہوں تمہاری، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔"

"پتا نہیں میں خود پاگل ہو گیا ہوں یا مجھے کسی دیوانی کے حوالے کر دیا گیا ہے ۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ ۔ ۔

گاڑی نشیب میں جا رہی تھی۔ ۔ ۔ خاصی گہرائی میں کوئی سرسبز وادی تھی۔ ۔ ۔ دور ہی سے وہ منظر بڑا سہانا لگ رہا تھا۔ ۔ ۔ گھنٹوں ننگی چٹانیں دیکھتے دیکھتے آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔

"جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں تمہاری حیثیت میرے شوہر کی ہو گی۔ ۔ ۔ اور ہم ایک دوسرے کو ہنی، ڈارلنگ اور سوئیٹی کہہ کر مخاطب کریں گے۔" سونیا بولی۔

"تو یہ کیوں نہیں کہتیں کہ ہمکو شوہر اور بیوی کی اداکاری کرنی ہو گی ۔"

"جہنم میں جاؤ ۔" وہ بُرا سا منہ بنا کر بڑبڑائی ۔

وادی سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ سچ مچ بڑی خوبصورت جگہ معلوم ہوتی تھی۔ شاید راجگڑھ سے بھی زیادہ دلکش۔ ۔ ۔ ڈھلانوں پر پھولوں کے تختے لہلہا رہے تھے اور عجیب طرح کی خوشبو فضا میں چکراتی پھر رہی تھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے فطرت نے اپنی جواں سالی کے اظہار کیلئے

خصوصیت سے اِسی خطّے کو منتخب کیا ہو . . . چلّی کی کھوپڑی میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔

"یہ تو خوابوں کی وادی معلوم ہوتی ہے" اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

سونیا مسکرائی تھی اور طویل سانس لے کر بولی "بالکل ہی غبی نہیں معلوم ہوتے"

"کیا مطلب . . . بات بات پر میری توہین کیوں کر رہی ہو؟ اگر مجھے شوہر کا رول ادا کرنا ہے تو بیوی کے غلام کی حیثیت سے ہرگز نہیں"

"آ گئے دال روٹی پر۔ بہت ہی گھٹیا قسم کے مرد معلوم ہوتے ہو"

"تم جیسی بیباک عورت بھی آج تک میری نظروں سے نہیں گزری . . ."

گاڑی بستی میں پہنچ گئی تھی . . . آخر ایک جگہ رُک گئی . . .
بائیں جانب نیچی دیواروں والی ایک طویل و عریض عمارت تھی . . . .
جس پر بہت بڑے بڑے حروف میں "ساربان" لکھا ہوا تھا۔

"واہ" چلّی ہنس کر بولا "ساربان یعنی اونٹ ہانکنے والا . . . کیا یہ اونٹ خانہ ہے"

"جی نہیں . . . اوّل درجے کا ایک ہوٹل . . ."

"اور کوئی نام ہی نہیں سوجھا تھا یار لوگوں کو"

"یہاں کی خاص ڈش اونٹ کے کوفتے ہیں۔ اس لئے ہم یہیں قیام

کریں گے، مسٹر اینڈ مسز ایٹولا کے نام سے"

"تم ہو گی مسز ایٹولا . . . میں ہرگز ایٹولا بننا پسند نہیں کروں گا"

"یہاں تم میرے احکامات کی پابندی کرو گے . . . ورنہ گولی مار دی جائے گی . . . وہ دیکھو پورٹر ادھر ہی آ رہا ہے . . . یہ لو چابی اور ڈگی کھول کر سامان نکالو"

چلّی اُسے قہر آلود نظروں سے گھورتا ہوا نیچے اُتر گیا تھا۔

پورٹر نے سوٹ کیس اٹھائے تھے . . . اور چلّی اس کے پیچھے چل پڑا تھا . . . لڑکی نے اس سے کنجی لے کر گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کی تھی اور شاید اُسے گیراج میں رکھنے کے لئے گئی تھی۔

چلّی کاؤنٹر پر آیا۔ مجبوراً رجسٹر میں اپنا وہی نام درج کرانا پڑا تھا جو سونیا بتا کر گئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آ گئی اور پورٹر کے چلے جانے کے بعد بولی "میرا کام ختم ہو گیا اب میں تمہیں نظر نہیں آؤں گی"

"واہ یہ کیا بات ہوئی . . . جب یہی کرنا تھا تو نام مسٹر اینڈ مسز ایٹولا کیوں لکھوایا تھا"

"مجھ سے یہی کہا گیا تھا"

"کس نے کہا تھا"

"غیر ضروری باتوں سے اجتناب کرو، زیادہ دن زندہ رہو گے"

"یہ بار بار موت اور زندگی کی بات کیوں کر رہی ہو"

"جلدی معلوم ہو جائے گا۔"
اس جواب میں چلّی نے دھمکی محسوس کی تھی۔
وہ چلی گئی تھی اور چلّی بیٹھا سر کھجاتا رہ گیا تھا۔

●

ایک دن اور ایک رات تو شاہدہ نے کسی تشویش کے بغیر گزار دیئے تھے لیکن دوسرا دن گزارنا مشکل ہو گیا۔ کبھی غصّے میں بل کھاتی اور کبھی بسورنے لگتی۔ ملازمین چلّی کی تلاش میں الگ سرگرداں تھے۔ شاہدہ کا خیال رہ رہ کر ناہید کی طرف جاتا تھا اور وہ غصّے میں اپنی ہی بوٹیاں نوچنے لگتی تھی۔ ایڈونچر کی ساتھی لڑکیوں سے بھی جھگڑا کر بیٹھی تھی، اس لئے اب اتنی ہمت نہیں تھی کہ ناہید کی طرف رُخ کر سکتی۔

سر فیاض کو واقعات کا علم ہوا تو وہ الگ برافروختہ ہوئے۔

آخر تم چاہتی کیا ہو، اگر نہیں چاہتیں کہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہوں . . . " جملہ پورا کئے بغیر خاموش ہو گئے۔ غصّے کی زیادتی کی وجہ سے آواز گھٹ کر رہ گئی تھی۔ قریب تھا کہ شاہدہ رو پڑتی، بڑی بی آڑے آئیں، اُسے وہاں سے ہٹا لے گئیں۔ اور پھر وہ تنہائی میں اُن سے لپٹ کر اس بُری طرح روتی تھی کہ اُن کے بھی چھکے چھوٹ گئے تھے۔ بمشکل خاموش ہوئی تو

بڑی بی بولیں "خود کردہ را علاج نیست . . ."
"بیٹا تم نے بھی تو کمال کر دیا تھا . . ."
"میں کہتی تو ہوں کہ غلطی میری ہے . . . لیکن اب میں کیا کروں!"
"مجھے ڈر ہے کہ کہیں پرنس دولہا نے خودکشی نہ کر لی ہو!"
"کک ــــ کیوں؟" شاہدہ بوکھلا کر بولی۔
"وہ مجھے ایسے ہی لگتے تھے کہ دل ٹوٹ جانے پر خودکشی کر لیں۔"
"ایسا نہ کہو دائی اماں۔"
"یقین کرو بیٹی۔ ٹوٹ کر چاہا تھا انہوں نے۔"

شاہدہ پھر رو پڑی۔ ٹھیک اسی وقت فون کی گھنٹی بجی تھی اور بڑی بی نے ریسیور اٹھا لیا تھا . . . دوسری طرف کی باتیں سنتی رہی تھیں اور باادب لہجے میں بولی تھیں "ذرا ٹھہریئے . . . میں اطلاع دیتی ہوں۔"

ریسیور میز پر ڈال کر وہ پھر شاہدہ کی طرف آئی تھیں۔
"اب چپ ہو جاؤ بیٹا کسی کا فون ہے۔ کوئی بیگم صاحبہ ہیں تمہیں پوچھ رہی ہیں۔"
"کیا نام ہے؟"
"نام تو میں نے نہیں پوچھا۔"
"کہہ دو۔ میں موجود نہیں ہوں گھر پر۔"
"بڑی بات ہے میں نے تو اُن سے کہہ دیا تھا کہ تم گھر ہی پر ہو۔"
"تم نے اچھا نہیں کیا کم از کم مجھ سے تو پوچھ لیا کرو . . ."

"اب خیال رکھوں گی بیٹا۔ ۔ ۔ اس وقت تو دیکھ ہی لو۔"

شاہدہ نے طوعاً و کرہاً کال ریسیو کی تھی اور دوسری طرف کی آواز پہچان کر آپے سے باہر ہوگئی تھی۔ یہ ناہید کی آواز تھی۔

"خبردار جو آئندہ مجھ سے ملنے کی کوشش کی۔" وہ ماؤتھ پیس میں چیخی تھی۔

"میں صرف یہ پوچھنا چاہتی تھی۔" ناہید کی آواز آئی "بے چارہ زندہ بھی ہے یا تم لوگوں نے زہر کا انجکشن دلوا دیا۔ ۔ ۔

"شٹ اپ۔"

"میں پولیس کو مطلع کرنے جا رہی ہوں کہ پرنس جتی پرویز کی زندگی خطرے میں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب اسی وقت سمجھ میں آئے گا جب پولیس چھاپہ مارے گی۔"

"تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا۔"

"ذرہ برابر بھی مروت نہیں کروں گی۔"

"تم آخر ہوتی کون ہو؟"

"وہ میرا محبوب ہے۔" ناہید نے سرد لہجے میں کہا۔

"چپ کُتیا۔"

"ہاں۔ ۔ ۔ ہاں۔ ۔ ۔ میں نے اُسے قتل کر دیا ہے۔ ۔ ۔ اس لئے کہ تجھ جیسی کُتیا کے دام میں پھنس گیا تھا۔"

"ارے ارے۔ ۔ ۔ یہ کیا کہہ رہی ہو بیٹیا۔" عقب سے بڑی بی بولیں۔

"تم چپ رہو۔"

"اوہ۔ ۔ ۔ تو وہ تمہارے پاس موجود ہے۔" دوسری طرف سے آواز آئی "کچھ کہنا چاہتا ہے اور تم اُس کی زبان بندی کر رہی ہو۔ ۔ ۔ زبان پر پہرے بٹھا دو۔ دل پر نہیں بٹھا سکتیں۔ تمہارے پاس بیٹھ کر بھی وہ میرے ہی بارے میں سوچے گا۔"

"جہنم میں جاؤ۔" کہہ کر شاہدہ نے ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔ ۔ ۔ اور خود کرسی پر گر کر ہانپنے لگی۔

"تمہیں کیا ہوگیا ہے۔ ۔ ۔ بٹیا۔ کس سے یہ سب کچھ کہہ رہی تھیں۔ ۔ ۔" بڑی بی آگے بڑھ کر بولیں۔

"ناہید کُتیا تھی۔"

"کون ناہید۔ ۔ ۔"

"دس بار کہتی ہیں کیا؟"

"ثریا بی بی کی بیٹی۔ ۔ ۔"

"کُتیا ہے۔ ۔ ۔ کُتیا ہے۔ ۔ ۔"

"اٹھوا لاتی تھیں ؟" بڑی بی پر گویا حیرت کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔

"پھر کیا کرتی ۔ دونوں کو رنگ رلیاں منانے دیتی"

"اگر یہ بات ہے تو . . . اب پرنس دولہا شاید ہی کبھی اپنی شکل دکھائیں . . میں انہیں ایسا بھی نہیں سمجھتی تھی"

"ارے وہ کتیا . . تم اُسے نہیں جانتیں . . چلی کا کوئی قصور نہیں خود اسی نے ڈورے ڈالے تھے"

"لیکن پرنس دولہا کو کیا ہوا تھا"

"مرد پھر مرد ہوتا ہے"

"آج بڑی سمجھداری کی باتیں کر رہی ہو بیٹیا"

"ارے تو کیا میں اس کی دشمن ہوں . . . بس ذرا یہ بات تھی کہ مجھے اس کا بسورنا اور بات بات پر تھرتھی پھُلا لینا اچھا لگتا تھا۔ اسی لئے چھیڑتی رہتی تھی"

بڑی بی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"کیا اُن کے باپ کے خط پر بھی تمہیں سچ مچ غصہ نہیں آیا تھا" انہوں نے پوچھا۔

"ڈیڈی کی حالت دیکھ کر آیا تو تھا غصہ پھر سوچا سیدھے سادھے دیہاتی آدمی ہوں گے جو جی میں آیا لکھ دیا۔ یہ لوگ ہم شہریوں کی طرح منافق تو ہوتے نہیں"

"ارے . . . ارے بٹیا . . . چشم بددور . . . تم تو بالکل ہی بدل گئی ہو"

"اگر وہ نہ آیا تو میں مر جاؤں گی . . . خدا اس ناہید کی بچی کو غارت کرے"

بڑی بی بڑے غور سے اُسے دیکھے جا رہی تھیں۔

"اس طرح کیا دیکھے جا رہی ہو" دفعتاً شاہدہ جھنّا کر بولی۔

"سوچ رہی ہوں تمہاری نظر اتار دوں۔ صدقہ دوں"

"ارے تو کیا اب تک مجھے پاگل سمجھتی رہی ہو"

"پاگل ہوں تمہارے دشمن . . . میں تو صرف مزاج کی بات کر رہی تھی بٹیا . . . اللہ تمہارا مزاج ہمیشہ ایسا ہی رکھے جیسا اس وقت ہے۔ پرنس دولہا ہوتے تو خوشی کے مارے ناچنے لگتے"

"اچھا تو کیا وہ تم سے میری باتیں کیا کرتا تھا"

"تمہارے علاوہ اور کسی کی بات ہی نہیں کرتے تھے"

"کیا باتیں کرتا تھا"

"یہ تو یاد نہیں۔ لیکن باتیں تمہاری ہی ہوتی تھیں"

"ہائے میں کیا کروں . . ."

بڑی بی کچھ نہ بولیں۔ لیکن آنکھوں سے مترشح ہوتا تھا جیسے دل ہی دل میں بے حد محظوظ ہو رہی ہوں۔

. . . .

●

چلی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ سونیا سچ مچ
اُسے چھوڑ کر چلی گئی تھی اور وہ کمرے میں تنہا تھا۔ آٹھ بجے کے قریب اُس
نے کھانا کمرے ہی میں طلب کیا تھا اور ابھی کھانے سے فارغ بھی نہیں ہوا
تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔

"آجاؤ۔ ۔ ۔" وہ حلق کے بل بولا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے میں منہ سے نوالہ نکل کر گود میں آگرا تھا۔ ایک
پولیس انسپکٹر دو کانسٹیبلوں سمیت کمرے میں داخل ہوتا ہوا دکھائی دیا۔

ایک کانسٹیبل کے ہاتھ میں وہی سوٹ کیس تھا جسے چلی سونیا کے
کہنے پر ہوٹل ہی میں چھوڑ آیا تھا۔

"کھانا کھا رہے ہو۔" انسپکٹر نے پوچھا۔

"ج ج۔ ۔ ۔ جی ہاں۔ ۔ ۔ تشریف رکھیے۔"

"کھانا کھا لو۔"

"بَ۔ ۔ ۔ بس کھا چکا۔ ۔ ۔"

"یہ سوٹ کیس تمہارا ہے۔ ۔ ۔"

"ج۔ ۔ ۔ جی ہاں۔ ۔ ۔"

"کیا یہ وہی سوٹ کیس ہے جو تم اپنے ساتھ لائے تھے۔"

"جی میں نہیں سمجھا۔" چلی کے لہجے میں حیرت تھی۔

"تم اپنے ساتھ جو سوٹ کیس لائے تھے اس کا رنگ سیاہ تھا۔ ۔ ۔"

"آہا۔" چلی اچھل پڑا "کیا آپ نے شہباز خان کو پکڑ لیا ہے۔۔"

انسپکٹر نے اُسے غور سے دیکھا تھا اور دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ خود چلی
بوکھلا کر بولا "میں نہیں سمجھا کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔"

"یہ شہباز خان کون ہے۔؟"

"جی یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔"

"تم راج گڑھ کیوں آئے تھے؟"

"جی بس۔ ۔ ۔ یونہی تفریحاً۔ ۔ ۔ آپ تو دہلائے دے رہے ہیں۔
کیا مجھ پر کوئی الزام ہے؟"

"میں نے تم سے صرف اُس سوٹ کیس کے بارے میں پوچھا تھا جو
اپنے ساتھ لائے تھے۔"

"جی وہ شہباز خان لے گیا"

"کہاں لے گیا۔۔ اور وہ کون ہے۔"

"یہ سب مجھے نہیں معلوم، جس کمرے سے آپ کو یہ سوٹ کیس ملا ہے
شہباز خان اُسی میں مقیم تھا۔ آج صبح میں باہر گیا تھا۔ واپس آیا تو کاؤنٹر
کلرک نے بتایا کہ شہباز خان چلا گیا ہے۔ ۔ ۔ کمرے میں پہنچا تو میرا

سوٹ کیس غائب تھا۔ لیکن صرف سوٹ کیس میری ساری چیزیں وہ اپنے سوٹ کیس میں منتقل کرکے چھوڑ گیا تھا۔"

"صرف سوٹ کیس لے گیا؟"

"جی ہاں اس کے علاوہ میرا ایک تنکا بھی نہیں لے گیا؟"

"سوال تو یہ ہے اگر تم شہباز خان کو جانتے نہیں تھے تو اس کے کمرے میں قیام کیسے ہوا تھا تمہارا۔"

"مم . . . میرے ایک دوست نے اس کا پتہ دیا تھا۔"

"اور وہ تمہارا سوٹ کیس لے بھاگا۔"

"جی ہاں . . . یہی بات ہے۔ لیکن کمرے کا ایک ہفتے کا پیشگی کرایہ بھی ادا کر گیا ہے۔ لہٰذا میں نہیں چاہتا کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی کی جائے۔ پسند آ گیا ہوگا میرا سوٹ کیس۔"

"اچھی بات ہے تو ہم اس کی بجائے فی الحال تمہیں ہی بند کئے دیتے ہیں۔"

"کک . . . کیا مطلب۔"

"تم حراست میں ہو۔"

"وہ . . . وہ . . . سونیا کہاں گئی۔"

"کون سونیا۔؟"

"وہی جو مجھے یہاں لائی ہے . . ."

"اچھا وہ عورت۔ یہ بھی تمہیں بتاؤ گے کہ وہ کہاں ہے۔"

"کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں . . . میں اُس کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا۔ وہ میرے پاس پہنچی تھی اور کہا تھا کہ رئیس الحسن نے اطلاع

دی ہے کہ چلّی پرویز کو اُس علاقے کی سیر کرائی جائے، لہٰذا چلو میرے ساتھ۔ ذرا آپ خود سوچئے! اگر یہ بات نہ ہوتی تو اپنا سامان ہوٹل ہی میں کیوں چھوڑ دیتا۔ خدا کے لئے اب سچی بات بتا دیجئے، میرا قصور صرف اتنا ہے کہ بیوی سے میرا جھگڑا ہو گیا تھا لہٰذا اُسے سبق سکھانے کے لئے گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔"

"تو اتنی دور نکل آئے ہو جھگڑا کر کے۔"

"جب آپ سب کچھ جانتے ہیں تو پھر کیوں زچ کر رہے ہیں مجھے۔"

"میں کیا جانتا ہوں۔"

"یہی کہ میں نقلی نوٹ چھاپنے والوں کا ساتھی ہوں . . . حالانکہ یہ بالکل غلط ہے . . . . . . میں نے وقتی طور پر اس مکان میں پناہ لی تھی۔"

"اوہو! تو تم پر نقلی نوٹ چھاپنے کا بھی الزام ہے۔"

"میں کچھ نہیں جانتا۔" چلّی بُرا سا منہ بنا کر بولا۔

انسپکٹر تھوڑی دیر تک اُسے غور سے دیکھتا رہا تھا۔ پھر بولا تھا "نہیں مجھے اُس قصّے کا علم نہیں ہے . . . اگر تم ہی سب کچھ بتا دو تو شاید . . ."

"ٹھہریئے . . . میں بتاتا ہوں۔ میرا ضمیر احساسِ جرم کا شکار نہیں ہے۔ اس لئے مجھے قطعی پریشان نہ ہونا چاہیئے . . ."

پھر چلّی نے اپنی کہانی شروع کر دی تھی اور انسپکٹر کی جرح نے اُسے کہانی کے ابتدائی حصّوں تک کو دہرا دینے پر مجبور کر دیا تھا۔ یعنی کالج میں داخلے کے بعد سے اب تک کے سارے واقعات بتانے پڑے تھے۔

سب کچھ سُن لینے کے بعد انسپکٹر نے کہا تھا "پہلے میں معلوم کروں گا

کہ تم کسی بھی معاملے میں اپنے شہر کی پولیس کو مطلوب ہو یا نہیں۔ اُس کے بعد تم سے بات ہوگی۔"

"اگر وہ معاملہ نہیں ہے تو پھر کیا بات ہے؟" چلّی نے حیرانی سے کہا۔

"فکر مت کرو۔ تمہارا کیس میری سمجھ میں آگیا ہے۔ تم نے لوٹک لوٹا کا حوالہ دیا تھا نا۔"

"جی ہاں . . . میں وہاں کے رئیسِ اعظم کا بیٹا ہوں . . ."

"لوٹک لوٹا کے سارے باشندے تمہیں پہچانتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ بچہ بچہ جانتا ہے۔ بھلا مجھے وہاں کون نہ جانے گا۔"

"ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔" انسپکٹر نے کہا اور مڑ کر ایک کانسٹیبل سے بولا "ذرا حوالدار حمید اللہ کو تو بلانا۔"

"بہت بہتر جناب" کہہ کر وہ کمرے سے چلا گیا۔

انسپکٹر نے چلّی سے کہا "میں نے ایک ایسے آدمی کو بلوایا ہے، جو لوٹک لوٹا ہی کا رہنے والا ہے۔"

"کیا نام لیا تھا آپ نے۔" چلّی چونک کر بولا۔

"حوالدار حمید اللہ۔"

"کیا وہ یہاں ہے۔" چلّی چہک کر بولا "میرا رنگروٹ"

"میرا رنگروٹ۔"

"جی ہاں۔ بڑے شیخ صاحب یعنی میرے والد اسے پیار سے میرا رنگروٹ ہی کہتے ہیں۔"

اور پھر میرا رنگروٹ نے دروازے میں قدم رکھتے ہی "چھوٹے

شیخ جی" کا نعرہ لگایا تھا۔

"تم جانتے ہو انہیں" انسپکٹر نے گھور کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں جناب۔ ہمارے چھوٹے سرکار ہیں۔"

"انسپکٹر طویل سانس لے کر بولا" پتا نہیں بڑے سرکار کیسے ہوں گے۔"

"جی ان کے ڈاڑھی بھی ہے" حوالدار حمید اللہ نے نہایت خلوص سے کہا۔

"کیا مطلب۔"

"چھوٹے شیخ جی کے ڈاڑھی مُنڈوا دینے پر بڑے سرکار ناراض ہیں سنا ہے عاق بھی کر دیا ہے . . . لیکن جناب . . . گگ ـــ کیا معاملہ ہے . . . کوئی گڑبڑ۔"

"نہیں کچھ نہیں۔ بس جاؤ۔"

حوالدار چلّی کو مُڑ مُڑ کر دیکھتا ہوا رخصت ہوگیا تھا۔

"اب میری بات سنو . . . تم اس کمرے سے باہر قدم بھی نہیں نکالو گے۔" انسپکٹر نے چلّی سے کہا۔

"ایسا ہی ہوگا جناب۔" چلّی سر ہلا کر بولا۔ "لیکن آخر چکر کیا ہے۔"

"بعد میں بتا دیا جائے گا . . . اگر وہ عورت کیا نام بتایا تھا۔"

"سونیا۔"

"اگر میری عدم موجودگی میں وہ آجاتے تو کسی طرح اسے باتوں میں الجھا کر روک لینا۔"

"ارے پکڑ کر بند کر لوں گا یہیں . . . اگر آپ حکم دیں"

"جس طرح بھی ہو روک لینا"

"اگر اُس نے شور مچا دیا تو"

"ایک کانسٹیبل کمرے کی نگرانی کے لئے چھوڑے جا رہا ہوں"

"تب پھر اُسی سے کہہ دیجئے گا کہ اُسے واپس نہ جانے دے"

"نہیں تم ہی روکنا۔ شور بھی مچائے تو پرواہ نہ کرنا"

"جی بہت اچھا . . ."

انسپکٹر کمرے سے نکل گیا۔ چلّی نے اُٹھ کر بہت احتیاط سے دروازے کا بولٹ چڑھایا تھا اور بیٹھ کر ہانپنے لگا تھا۔

لیکن پھر اچھل پڑا۔ کمرے کے اندر ہی کی کوئی آواز تھی۔ چونک کر مڑا باتھ روم کا دروازہ آہستہ آہستہ کھل رہا تھا . . .

"ارے باپ رے" چلّی بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔

باتھ روم سے سونیا برآمد ہوئی تھی۔

"پکڑ کر بند کر لو۔ میں شور نہیں مچاؤں گی" اُس نے اوپری ہونٹ بھینچ کر زہریلے لہجے میں کہا۔

"تت . . . تم . . . یہاں کہاں . . ."

"سازش ہو رہی تھی میرے خلاف . . ."

"مم . . . میں . . . کیا کروں . . . میں کیا جانوں یہ سب کیا ہو رہا ہے"

"جیل جاؤ گے"

"نن . . . نہیں۔ میرا کوئی قصور نہیں"

"اس کے باوجود بھی جیل جاؤ گے"

"ارے تم جاؤ۔ بھاگو یہاں سے۔ وہ آ رہا ہوگا"

"آنے دو۔ اب تو ایک اور بھی الزام آئے گا تم پر مجھے بہکا کر میرے گھر سے نکال لاتے ہو . . ."

"ارے غضب خدا کا" چلّی اپنا منہ پیٹنے لگا۔

"اور اب مجھے مجبور کر رہے ہو کہ میں یہاں ہوٹل میں کمائی کروں"

"مر جاؤں گا" چلّی کراہا۔

"میری طرف سے جہنم میں بھی جاؤ"

"تم مجھے وہاں سے کیوں لائی تھیں"

"تمہاری بھلائی کے لئے، لیکن تم تو بالکل ہی ڈفر نکلے۔ انسپکٹر قطعی ثابت نہ کر سکتا کہ تم کوئی دوسرا سوٹ کیس لے کر گھر سے چلے تھے۔ آخر شہباز خان کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی"

"پتہ نہیں کس مصیبت میں پھنسا دیا ہے اس چچا کے بچے نے"

"اب بھی کچھ نہیں بگڑا . . . اگر میرے مشورے پر عمل کرو"

"بتاؤ — کیا کروں؟"

"انسپکٹر کو قطعی نہ بتانا کہ میں باتھ روم میں موجود ہوں . . ."

"نن نہیں . . . بتاؤں گا۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوگا"

"جو کچھ ہو چکا ہے تمہاری حماقت سے اُس میں اب کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، اب تو اسی جگہ معاملے کو سنبھالنا ہے"

"سنبھالو۔ خدا کے لئے ضرور سنبھالو" چلّی گڑگڑایا۔

تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی تھی . . . اور سونیا باتھ روم میں چلی گئی تھی۔

چلی نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ پولیس انسپکٹر سامنے کھڑا نظر آیا۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات تھے جیسے چلی کا مضحکہ اُڑانا چاہتا ہو۔

" اندر تشریف لائیے جناب " چلی بوکھلا کر بولا۔

" جی ہاں - آرہا ہوں " لہجہ بھی طنزیہ تھا۔ چلی سمجھا شاید اُسے یہاں سونیا کی موجودگی کا علم ہو گیا ہے۔

" تم نے ہمیں غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش کی ہے " انسپکٹر اسے غور سے دیکھتا ہوا بولا۔

" مم . . . میں نہیں سمجھا جناب "

" تم نے اپنے شہر میں جس عمارت کی نشان دہی کی تھی وہ ایک بہت معزز اور ذمے دار فرد کی اقامت گاہ ہے "

" ایسے ہی لوگ تو جعلی نوٹ چھاپتے ہیں، جن کی طرف خیال ہی نہ جا سکے " چلی جلدی سے بولا۔

" لہٰذا اب میں تمہیں اس الزام کے تحت زیرِ حراست لیتا ہوں کہ تم نے حکومت کے ایک ذمے دار پر نقلی نوٹ چھاپنے کا الزام لگایا ہے "

" ارے باپ . . . رے . . . لیکن وہ کون ہے، کس کا مکان ہے . . . "

" وزارتِ داخلہ کے سیکرٹری وہاں رہتے ہیں۔ ان دنوں

چھٹی پر ہیں اور گرمیاں گزارنے کے لئے انہی اطراف میں کہیں مقیم ہیں "

" میں کچھ نہیں جانتا۔ مجھ سے جو کچھ رئیس الحسن نے کہا تھا اُسی کے مطابق میں نے آپ کو بیان دیا تھا "

" کچھ بھی اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ آپ کے ہتھکڑیاں لگیں گی اور آپ اسی طرح یہاں سے اپنے شہر لے جائے جائیں گے۔ چھوٹے شیخ صاحب "

" اچھا ہتھکڑیاں مت ڈلوائیے میں یونہی چلا چلوں گا "

" ناممکن . . . ہتھکڑیاں تو ضرور لگیں گی۔ پہلے آپ پر کوکین کی نقل و حرکت کا شُبہ تھا۔ لیکن اب آپ نے خود ہی اپنے دوسرے جرم سے بھی پردہ اٹھا دیا ہے "

" کون سا دوسرا جُرم . . . "

" سرکاری افسران کے خلاف منافرت پھیلانا . . . "

" جناب انسپکٹر صاحب میں بالکل بے قصور ہوں۔ میں نے تو آج تک اس سرکاری آفیسر کی شکل تک نہیں دیکھی "

" کچھ بھی ہو۔ اب وہیں عدالت میں اپنی صفائی پیش کیجئے گا اور پھر میں کیا کروں مجھے تو آپ ہی کے شہر کی پولیس کی طرف سے ہدایت ملی ہے کہ کوکین برآمد نہ ہو سکنے کے باوجود بھی آپ کو گرفتار کر لیا جائے "

" یہ تو بہت بُرا ہوا . . . "

" بُرے سے بھی بدتر کہئے شیخ صاحب۔ کیا اپنے شہر کے کسی معزز آدمی سے آپ واقف ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ وہ بھی آپ کو جانتا ہو "

"ارے میں شہر کے ایک معزز آدمی کا داماد ہوں۔"

"کیا آپ کوئی نئی ہوائی چھوڑیں گے شیخ صاحب۔"

"خود اُسی بڑے آدمی سے معلوم کر سکتے ہیں آپ . . . میں فون نمبر بتاتا ہوں۔"

"رہنے دیجئے۔"

"میں کہہ رہا ہوں تصدیق کر لیجئے نا۔"

"فرمائیے . . . کون صاحب ہیں۔"

"سر فیاض۔" چلی نے کہا اور سر فیاض کے بارے میں بتانے لگا۔ فون نمبر بھی بتائے تھے۔

"تو میں سر فیاض کو اطلاع دے دوں کہ آپ زیرِ حراست ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔ آپ صرف یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ میں ان کا داماد ہوں یا نہیں۔"

"اس سے کیا فائدہ ہوگا۔"

"میں کیا جانوں . . ."

"عقل کے ناخن لیجئے۔ محض آپ کا بیان کافی نہیں ہے اور پھر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ کون ہیں۔ آپ نے ایک سرکاری افسر کے بارے میں غلط فہمی پھیلانے کی کوشش کی ہے۔ آپ گرفتار کئے جائیں گے اگر سر فیاض کو اس کا علم ہو گیا تو آپ کو ضمانت پر رہا کرا لینے کا انتظام پہلے سے کر رکھیں گے اور آپ کو زیادہ دنوں تک حوالات میں نہیں رہنا پڑے گا۔"

"خداوندا کس مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔"

"بس چپ چاپ بیٹھے رہیئے۔" انسپکٹر نے کہا۔ "یہاں سے جا نکلنے کی کوشش نہ کیجئے گا ورنہ جرم اور سنگین ہو جائے گا . . . میں ذرا ہتھکڑیاں لیتا آؤں۔"

وہ چلا گیا اور چلی نے پھر دروازہ بند کر کے بولٹ کر دیا۔ پھر وہ جھنّا کر باتھ روم کی طرف جھپٹا تھا۔ دروازہ کھولا اور ششدر رہ گیا۔ سونیا کا کہیں پتہ نہ تھا . . . اور پھر خاصی دیر بعد اُسے وہ کھڑکی نظر آئی تھی جس کی طرف اُس نے پہلے توجہ ہی نہیں دی تھی . . . کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ آگے بڑھ کر اُس نے دیکھا۔ دوسری طرف ویرانہ تھا۔ وہ نہایت آسانی سے فرار ہو گئی ہوگی۔

. . . .

سر فیاض کی کوٹھی میں کہرام مچ گیا تھا . . . شاہدہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ لیکن سر فیاض پر دل کا دورہ نہیں پڑا تھا۔ البتہ وہ آپے سے باہر ہو رہے تھے . . . بڑی بی شاہدہ کو وہاں سے ہٹا لے گئی تھیں۔

سر فیاض کا غصہ اپنی انتہائی منزلیں طے کر رہا تھا۔ ٹھیک اُسی وقت فون کی گھنٹی بجی تھی اور وہ فون کو اس طرح گھورنے لگے تھے جیسے ابھی کسی ملازم کو حکم دیں گے کہ وہ فون اٹھا کر باہر پھینک آئے۔

لیکن پھر بہت بُرا سا منہ بنا کر ریسیور اٹھایا تھا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ "کیا سر فیاض۔"

"ہاں۔ کون ہے۔ کیا بات ہے۔؟"

"آپ کا داماد حلقے کے تھانے کی حوالات میں آپ کا منتظر ہے؟"

"تم کون ہو؟"

"کیا اب میری آواز بھی نہیں پہچان سکتے، حالانکہ خواب میں بھی میں ہی نظر آتا ہوں گا۔"

"اوہ۔ تم ہو۔"

"جی ہاں آپ کا دیرینہ خادم رئیس الحسن المعروف بہ چچا۔ لیکن اگر آپ نے میری پوری بات سُنے بغیر ریسیور رکھ دیا تو بڑے خسارے میں رہیں گے۔"

"بکو۔ ۔ ۔ کیا بک رہے ہو۔"

"آپ کے بھتیجے ڈی۔ ایس۔ پی نے مجھے پھانسنے کی کوشش کی تھی، لیکن پھنس گیا آپ کا داماد۔ ۔ ۔ اب یہ بھی دیکھئے گا کہ اُس ڈی۔ ایس۔ پی کا کیا حشر کرتا ہوں۔"

"پتہ نہیں تم کیا کہہ رہے ہو۔"

"انجان بننے کی کوشش نہ کیجئے۔ اُس نے یہ حرکت آپ ہی کے اشارے پر کی تھی۔ آپ نے اُسے یقین دلایا تھا کہ میں منشیات کا غیر قانونی کاروبار کرتا ہوں۔ ۔ ۔ آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں سر فیاض۔ یہ بے چارہ ڈی، ایس، پی محض آپ کی وجہ سے مارا گیا۔ ۔ ۔ دو ہی ماہ میں اے۔ ایس۔ پی سے ڈی۔ ایس۔ پی ہوگیا تھا، لیکن میں اب اُسے ایسی جگہ پھنکواؤں گا کہ دو ہی ماہ میں رو رو کر خدا سے دُعا مانگے گا کہ اُسے معمولی کانسٹیبل کی حیثیت سے کسی فرسٹ مارکٹ کے آس پاس تعینات کرا دے۔"

سر فیاض نے جھنا کر ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا۔

اور پھر وہ دہاڑتے ہوئے وہاں پہنچے تھے جہاں مشاہدہ بیٹھی اپنے پیٹنے پر دوہتڑ چلا رہی تھی۔

"میں اس کی ضمانت کے لئے ہرگز نہیں جاؤں گا۔" انہوں نے گرج کر کہا۔

"آپ سے کون کہہ رہا ہے۔" وہ بھی انہی کے سے انداز میں چیخی تھی اور وہ ششدر رہ گئے تھے۔

"میں خود ضمانت دے سکتی ہوں۔ صاحب جائیداد ہوں۔ ۔ ۔"

"لیکن اب وہ اس کوٹھی میں قدم نہیں رکھ سکے گا۔ ۔ ۔" سر فیاض سنبھالا لے کر بولے۔

"نہیں آئے گا یہاں۔ اور میں بھی جارہی ہوں۔"

"اسے سمجھاؤ۔" سر فیاض نے بڑی بی کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جی بہت اچھا۔" وہ گڑگڑا گئیں۔

"اب مجھے کوئی نہیں سمجھا سکے گا۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔ آپ ہی کی وجہ سے میرا اُس سے جھگڑا ہوا تھا۔ ۔ ۔ محض میرے ڈر سے وہ بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔ پتا نہیں کس نے کس چکر میں پھانس دیا تھا۔ ۔ ۔"

"میں جانتا ہوں کس نے پھانسا ہے۔"

"مجھے بتایئے۔ میں اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال دوں گی۔"

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔"

"مجھے نام بتایئے۔" وہ ہذیانی انداز میں چیخی۔

"رئیس الحسن۔" سر فیاض آنکھیں نکال کر بولے تھے۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ۔ ۔ اُسی نے تو ہماری شادی کرائی تھی۔"

"میں جانتا ہوں۔ وہ مجھے ذلیل کرنے پر تُلا ہوا ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو میں اُسے دیکھ لوں گی۔"

"بیٹھو چین سے گھر میں دیکھا جائے گا۔"

"یعنی میں اُسے حوالات میں پڑا رہنے دوں۔"

"ضروری ہے۔ اُسے بھی عقل آجائے گی۔"

"ہرگز نہیں۔ وہ جیسا ہے اُسے ویسا ہی رہنا چاہیئے۔"

"جہنم میں جاؤ۔ میں کچھ نہیں جانتا۔" سرفیاض پیر پٹختے ہوئے وہاں سے گئے۔

شاہدہ نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا تھا۔ گیراج سے گاڑی نکلوائی تھی اور اس تھانے کی طرف چل پڑی تھی جہاں چلّی کو رکھا گیا تھا۔

عجیب اتفاق تھا کہ رئیس الحسن سے بھی وہیں مڈبھیڑ ہوگئی۔ انچارج سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا، شاہدہ کو دیکھ کر ایک دم سیریس ہوگیا۔

"میں چلّی پرویز کی ضمانت دینے آئی ہوں۔" اُس نے انچارج سے کہا تھا۔

"اوہ۔ تشریف رکھیئے محترمہ۔۔۔ آپ کی تعریف۔"

"میرے شوہر ہیں۔۔۔ کسی بدبخت نے اُن سے کسی قسم کا انتقام لیا ہے۔"

"لیکن ضمانت تو عدالت سے ہوگی محترمہ۔"

"اچھا اچھا۔۔۔ میں اُن سے ملنا چاہتی ہوں۔۔۔"

"ہاں۔ یہ ممکن ہے۔ میرے ساتھ تشریف لائیے۔" وہ اٹھتا ہوا بولا۔

"آپ بھی زحمت فرمائیے۔" شاہدہ نے رئیس الحسن سے زہریلے لہجے میں کہا تھا۔ وہ سر ہلا کر مسکراتا ہوا اُٹھ گیا۔

حوالات کے کٹہرے کے قریب پہنچ کر چلّی نے انچارج کو آنکھ مار کر

چلے جانے کا اشارہ کیا تھا۔

وہ انہیں وہیں چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔۔۔ چلّی کٹہرے کی سلاخیں تھامے کھڑا مغموم آنکھوں سے شاہدہ کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

"اس طرح مت دیکھو خدا کے لئے ورنہ میں رو پڑوں گی۔"

"اصلی بات کوئی نہیں بتاتا۔ بس جھوٹے الزام لگائے جا رہے ہیں مجھ پر۔" چلّی دردناک لہجے میں بولا۔

"کون سی اصلی بات۔"

"دل شکستہ ہو کر۔۔۔ راجگڑھ چلا گیا تھا۔ وہاں زندگی کا خاتمہ ہی کر دینے کی سوچی اور ٹرین کی پٹڑی پر لیٹ گیا۔۔۔ لیٹا رہا۔۔۔ پھر ایک چرواہے کو کہتے سنا کہ آج ٹرین بارہ گھنٹے لیٹ ہے۔ سخت غصّہ آیا۔ سوچا زہر خریدوں گا اور ہوٹل کے کمرے ہی میں جان دے دوں گا۔۔۔ پٹڑی سے اُٹھ کر چلا آیا۔ زہر خریدا۔۔۔"

"کون سا زہر۔۔۔"

"افیون۔۔۔"

"اچھا تو پھر۔"

"یہاں بھی فراڈ ہوگیا۔۔۔ گھول کر پی جانے کے بعد پتا چلا کہ افیون نہیں کتابت کی روشنائی کی گولی تھی۔"

"اللہ کا شکر ہے کہ اِس فراڈ نے تمہاری جان بچالی۔۔۔ لیکن پکڑے کیسے گئے۔۔۔"

"میں نہیں جانتا۔ بس پکڑ لائے۔۔۔ پولیس والوں میں سے کوئی کہتا تھا کہ میں نے کسی سرکاری افسر کو بدنام کرنے کی کوشش کی تھی اور کہتا تھا کہ

کوکین تھی میرے پاس — خدا ہی بہتر جانے . . . میں تو کچھ بھی نہیں جانتا۔"

"میں نے سنا ہے کہ تمہارے ان ہمدرد نے تمہیں اِس حال کو پہنچایا ہے۔" شاہدہ نے رئیس الحسن کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"چچا نے" چلی کے لہجے میں حیرت تھی پھر وہ اپنا منہ پیٹتا ہوا بولا "شیطان کے کان بہرے — تم کیسی باتیں کر رہی ہو . . . یہ تو میرے محسن ہیں اگر یہ نہ ہوتے تو واقعی پھنس جاتا . . ."

"اب چھٹنے میں کیا رہ گیا ہے کہ عدالت سے ضمانت ہوگی . . ."

"کون کہتا ہے . . . میں تو اپنی مرضی سے یہاں کچھ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔ یہاں کی پولیس کو راجگڑھ پولیس کے بیان پر یقین تھوڑا ہی آیا ہے۔ نہ میرے پاس سے کوکین برآمد کر سکے تھے اور نہ اُن کے پاس ایسا ہی کوئی ثبوت ہے کہ میں نے کسی سرکاری افسر کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہو۔"

"تو یہ تمہیں چھوڑ دیں گے۔"

"اور کیا — میں نے کہا اب آ ہی گیا ہوں تو اچھی طرح دیکھ لوں کہ حوالات کیا چیز ہوتی ہے . . ."

رئیس الحسن اس دوران میں بالکل خاموش کھڑا رہا تھا۔

شاہدہ نے بھرائی ہوئی آواز میں اُس سے کہا "ڈیڈی کہہ رہے تھے کہ تم نے پھنسایا ہے چلی پرویز کو۔"

"میں پھنساؤں گا اپنے نورِ نظر لختِ جگر کو؟" رئیس الحسن نے اپنے لہجے میں بے پناہ حیرت پیدا کر کے کہا۔

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" چلی نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"تو پھر یہاں کیوں آتے ہو؟"

"دراصل میرا ارادہ ہے کہ یہاں کی جیل اور حوالات سے متعلق ایک کتاب لکھوں۔"

"ختم کرو . . . فضول باتیں اور چلو میرے ساتھ۔"

"ہاں۔ ہاں۔" رئیس الحسن سر ہلا کر بولا "اب اس وقت تو چلے ہی جاؤ۔ پھر جب دل چاہے مجھ سے کہہ دینا دوبارہ بند کرا دوں گا . . . کتاب ایک دو دن میں تو لکھی نہیں جائے گی۔"

"لیکن میں تمہیں لے کہاں جاؤں گی۔" شاہدہ نے مایوسانہ لہجہ میں کہا۔

"کیوں؟ . . ." چلی اچھل پڑا۔

"اس گھر میں نہیں لے جا سکتی اور اب میں بھی وہاں نہیں رہوں گی . . ."

رئیس الحسن نے شاہدہ کی نظر بچا کر چلی کو آنکھ ماری تھی۔ چلی حیرت سے منہ کھولے کھڑا رہا۔

"ہاں . . . میں اب ڈیڈی کے ساتھ نہیں رہ سکتی . . . اُن کا وقار مجروح ہوتا ہے . . . تمہاری ضمانت دینے پر بھی تیار نہیں ہوتے تھے۔"

"لاحول ولاقوۃ — کیا میں کہیں مر گیا ہوا تھا۔" رئیس الحسن بولا۔

"پھر میں خود ہی چلی آئی۔ کسی کی محتاج نہیں . . . میرے نام بھی اتنی جائیداد ہے، جو ہم دونوں کے لئے کافی ہو۔"

"مم . . . مجھے . . . شرمندہ نہ کرو . . ." چلی بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"جب تک میں ایک فرنشڈ بنگلے کا انتظام نہ کر لوں . . . تم حوالات ہی

یں رہو گے" دفعتاً رئیس الحسن نے کہا۔

"کیا مطلب" شاہدہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اگر تم کوٹھی میں واپس نہیں جانا چاہتیں تو۔ ۔ ۔"

"ہاں میں یہی چاہتی ہوں کہ اپنے شوہر کو اپنے گھر میں لے جاؤں باپ کے گھر میں نہیں"

"بس تو پھر تم بھی یہیں ٹھہرو ۔۔۔ بلکہ مناسب تو یہ ہوگا کہ تم بھی اندر ہی۔۔"

رئیس الحسن نے کٹہرے کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"آئیڈیا" شاہدہ اچھل پڑی۔

"اور ایڈونچر بھی" چلّی نے زوردار قہقہہ لگایا۔

"بس تو پھر ٹھہرو" رئیس الحسن تیزی سے آگے بڑھ گیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شاہدہ چلّی کے ہاتھ پر بڑے پیار سے ہاتھ پھیرتی رہی۔ پھر اُس نے پوچھا۔

"آخر تم اس طرح بھاگ گئے کیوں تھے"

"کیا کرتا۔ تم خواہ مخواہ غلط فہمی میں مُبتلا ہو گئی تھیں حالانکہ کہاں تم اور کہاں نک چپٹی نامید"

"اس کی ناک چپٹی تو نہیں ہے"

"مجھے تو لگتی ہے۔ بہر حال کئی بار کہہ چکی تھی کہ کبھی میرا اسٹوڈیو دیکھو۔ ۔ ۔ اتفاقاً ہی دیکھنا پڑا"

"لیکن وہ تو کہہ رہی تھی کہ تم اُس کے محبوب ہو"

"کہہ رہی ہوگی۔ میں نے تو نہیں کہا تھا کہ وہ میری محبوبہ ہے۔ ۔ ۔"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے"

"بس تم ہی ایک دم سے بھڑک اٹھتی ہو"

"میں خوب سمجھتی ہوں" وہ مُسکرا کر بولی "تم مجھ سے ڈرتے ہو"

"تم سے نہیں ڈروں گا تو کیا الزبتھ ٹیلر سے ڈروں گا۔ بڑے بدنصیب ہیں وہ شوہر جو بیویوں سے نہیں ڈرتے"

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو۔ ۔ ۔" وہ آنکھیں بند کر کے بولی۔

"اور کیا؟"

"ایک بار پھر کہو"

چلّی نے الزبتھ ٹیلر کے حوالے سمیت جملہ دوبارہ ادا کیا تھا۔

"یہ بار بار الزبتھ ٹیلر کا نام کیوں لے رہے ہو"

"مثال کے طور پر مری جان ۔۔۔ مطلب یہ کہ تم اُس سے کہیں زیادہ حسین ہو"

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔ میں اُن عورتوں میں سے نہیں ہوں جو اپنے حسن کی تعریف سن کر خوش ہوتی ہیں۔ ۔ ۔ بس اتنا ہی کافی ہے کہ مجھ سے ڈرتے رہو۔ جتنا ڈرو گے اتنا ہی ٹوٹ کر چاہوں گی"

"یقین کرو۔ چھپکلی کے بعد تمہی سے ڈرتا ہوں ۔ ۔ ۔"

"چھپکلی سے تو مجھے بھی بڑا ڈر لگتا ہے۔ کتنی ذہنی ہم آہنگی ہے ہم دونوں میں"

چلّی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ رئیس الحسن واپس آگیا۔ حوالات کے قفل کی چابی اُس کے ہاتھ میں تھی۔ اُس نے دروازہ کھولا اور شاہدہ اندر چلی گئی دروازے کو دوبارہ مقفل کر کے اُس نے چلّی سے کہا تھا "پوری بات بتا دینا۔ ۔ ۔ شاید انہیں کچھ نہیں معلوم"

شاہدہ اُسے دیکھتی رہ گئی تھی اور وہ چلا گیا تھا۔ پھر وہ چلّی کو

گھورنے لگی۔

"قصہ دراصل یہ ہے کہ تمہارے ڈیڈی نے چچا کو پھنسوانے کی کوشش کی تھی۔"

"کیا کہہ رہے ہو۔ میں نہیں سمجھی۔"

"تمہارے کوئی کزن ڈی۔ ایس۔ پی ہیں۔ ۔ ۔"

"ہاں ہے تو۔ تنویر کا بچہ۔"

"تمہارے ڈیڈی نے انہیں ٹپ کیا تھا کہ چچا کوکین کی تجارت کرتے ہیں۔ یہاں سے اندرونِ ملک بھجواتے ہیں۔ تم جانتی ہو کہ چچا کتنے پہنچ کے آدمی ہیں۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اُن کے جاننے والوں اور مداحوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ ۔ ۔ بہرحال ڈی ایس پی صاحب نے چچا کی نگرانی شروع کرا دی۔ چچا کو علم ہوا تو وہ انہیں سبق دینے پر تُل گئے۔ اُسی دوران میں تم مجھ سے خفا ہو گئیں۔ گھر چھوڑنا پڑا۔ چچا سے ملاقات ہوئی کہنے لگے۔ کچھ دنوں کے لئے باہر چلے جاؤ۔ ۔ ۔ انہوں نے میری روانگی کا انتظام کیا۔ تمہارے کزن کے ماتحت پہچانتے نہیں، سمجھے شاید میں چچا کی کوکین لے کر اندرونِ ملک جا رہا ہوں۔ ایک آدمی راجگڑھ [illegible]

"ہاں۔ ۔ ۔ انہیں کی عنایت ہے۔"

"اور یہ اُسی کا حلقہ ہے۔"

"جی ہاں۔ سُنا ہے تھوڑی دیر بعد تشریف لائیں گے۔"

"آنے دو۔ چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گی۔"

"کیا کرو گی۔"

"بس آنے دو۔ لیکن ٹھہرو۔ ۔ ۔ کہیں میرے حوالات میں بند ہونے سے بیچارے پر کوئی مصیبت نہ نازل ہو جائے۔ ۔ ۔"

"چچا نے کر لیا ہوگا اُس کا بھی کچھ انتظام۔ ۔ ۔"

"خیر آنے دو اس گھوڑ موہنے تنویر کو۔"

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ کئی قدموں کی آوازیں سنائی دیں اور پھر وہ لوگ سامنے آگئے۔ ۔ ۔ ڈی ایس۔ پی تنہا نہیں تھا۔ سرفیاض بھی ساتھ تھے۔ ۔ ۔ اور اسٹیشن انچارج اُن کے پیچھے تھا۔ شاہدہ پر نظر پڑتے ہی سرفیاض اچانک رُک گئے۔ ۔ ۔ ۔ ڈی۔ ایس۔ پی نے متحیرانہ انداز میں پلکیں جھپکائی تھیں۔ پھر وہ انچارج کی طرف مڑ کر دھاڑا۔ "یہ سب کیا ہے۔ ۔ ۔ یہ خاتون یہاں کیوں؟"

"جناب عالی۔ میں کیا کرتا۔ یہ خاتون یہاں آئیں اور بتایا کہ ملزم اُن کا

"قطعی نہیں . . . ہم دونوں اقبالی مجرم ہیں" شاہدہ نے سخت لہجے میں کہا۔

"قفل کھول کر انہیں باہر نکالو" ڈی۔ایس۔پی نے انچارج سے کہا۔

"بہت بہتر جناب" کہہ کر وہ آگے بڑھا ہی تھا کہ ایک سپاہی دوڑتا ہوا وہاں پہنچا اور جلدی جلدی کہنے لگا "ڈی۔آئی۔جی صاحب جناب . . . "

"کیا مطلب . . . " ڈی۔ایس۔پی بوکھلا گیا۔

"اِدھر ہی آرہے ہیں جناب۔ دفتر میں نہیں رکے۔" وہ ہانپتا ہوا بولا۔

ڈی۔ایس۔پی اور انچارج کا یہ عالم تھا جیسے وہیں ناچنا شروع کر دیں گے اور پھر ڈی آئی جی دکھائی دیا تھا۔ تنہا نہیں تھا اس کے ساتھ رئیس الحسن بھی تھا۔ اُس نے کٹہرے کی طرف ہاتھ اٹھا کر اونچی آواز میں کہا "یہ ہے میرا دوست اور اس کی بیوی، جنہیں خواہ مخواہ کوکین کی غیر قانونی تجارت کے الزام میں پھانسا گیا ہے"

"کیا کوکین برآمد ہوئی ہے، اس کے پاس سے" ڈی۔آئی۔جی نے ڈی ایس پی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں . . . حضورِ عالی غلط فہمی ہوئی تھی۔ انہیں چھوڑا جا رہا ہے" ڈی۔ایس۔پی کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ "کوکین لے جانے والے کا تعاقب کرنے والے سے غلطی ہوئی تھی۔ راجگڑھ پولیس نے غلط آدمی کو بھیج دیا۔ یہ بلاشبہ ذی عزت لوگ ہیں"

"تو یہ راجگڑھ پولیس کی غلطی ہے . . . "

"جی . . . جنابِ عالی"

"چلو ـــ رہا کر دو انہیں"

"چھوڑنے ہی جا رہے تھے جناب"

"ایسی غلط فہمیاں نہ دیکھیں نہ سنیں"

"اوہ ـ سر فیاض ـــ آپ ـــ" دفعتاً ڈی، آئی جی بولا "آپ یہاں کہاں . . . "

سر فیاض سر جھکائے کٹہرے تھے۔ آہستہ سے بولے "میری بیٹی اور داماد ہیں جناب"

"اوہ ـــ مجھے بے حد شرمندگی ہے سر فیاض . . . کبھی کبھی غلط فہمی کی بنا پر ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس معاملے کو آگے نہ بڑھائیں گے"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا" سر فیاض کی آواز پھٹنے لگی تھی۔

●

جلی اور شاہدہ نئے مکان میں منتقل ہو گئے تھے۔ شاہدہ کسی طرح بھی اس پر راضی نہ ہوئی کہ وہ کوٹھی میں قدم بھی رکھے۔ ڈی۔ایس۔پی کی حالت تباہ تھی اور سر فیاض پر ایک بار پھر دل کا دورہ پڑ گیا تھا۔

جلی بے حد مگن دکھائی دیتا تھا۔ دن میں ایک آدھ بار ضرور اعتراف کرتا تھا کہ وہ شاہدہ سے بہت ڈرتا ہے اور شاہدہ ٹھنک کر کہتی "آتی تو بہت کرتی ہوں۔ تم خواہ مخواہ ڈرتے ہو۔ اچھا بتاؤ غصے میں کیسی لگتی ہوں"

"ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہلاکو کی جنس تبدیل ہوگئی ہو۔"
"اور تم مجھ سے محبت بھی کرتے ہو۔"
"ایسی ویسی۔ اگر تم مجھے نہ ملتیں تو مارے غم کے مونگ پھلیاں بیچتا پھرتا۔"
"مگر پچھلی رات تم نے سالن اچھا نہیں پکایا تھا۔"
"تو پھر سکھا دو نا۔"
"گھاس تو نہیں کھا گئے۔ . . . مجھے آتا ہے پکانا۔"
"مل ہی جائے گا . . . باورچی بھی۔"
"باورچی — ہرگز نہیں۔ اتنی مالدار نہیں ہوں کہ باورچی آنورڈ کر سکوں۔"
"کھانا پکانے کی ترکیبوں والی کتاب خرید لاؤں گا۔"
"ہرگز نہیں۔ وہ تو اور بھی بکواس ہوتی ہے۔ ایک بار میں نے ایسی ہی کتاب کی ترکیب سے حلوہ پکایا تھا۔ جانتے ہو کیا ہوا تھا۔"
چلی نے سر کو نفی میں جنبش دی۔
"اس سے لفافے چپکائے گئے تھے۔ کاغذ کی تھیلیاں بنائی گئی تھیں۔"
چلی نے ٹھنڈی سانس لے کر آسمان کی طرف دیکھا تھا۔ بصد سوز و گداز گانے لگا تھا ع

سجنی سے کر دگے بہانہ کیا

ختم شد

. . . .